ایک لڑکی

ایک لڑکی

اور دوسری کہانیاں

(خواجہ) احمد عبّاس

لاہور
مکتبۂ — اُردُو

(جملہ حقوق محفوظ)

قیمت .. مجلد .. عہ/

اکتوبر ۱۹۴۲ء

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں چودھری نذیر احمد مالک مکتبہ اُردو لاہور کے اہتمام سے چھپی

ایک لڑکی

کے نام !

کوئی پوچھے اگر وہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

(مجاز)

مندرجات

پیش لفظ ۷

فیصلہ	۹
ایک لڑکی	۳۲
سرکشی	۵۲
ناگن	۷۱
پہلا پتھر	۸۴
ابابیل	۹۷
تین عورتیں	۱۰۳
دراروغہ صاحب	۱۱۷
معمار	۱۲۹
رادھا	۱۳۹

"جاگے سنسار....."

"سوئے سنسار اور جاگے پاک پروردگار۔

"ہمارا تمہارا خدا بادشا، خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔

"ایک تھا راجہ۔ اس کے سات بیٹے تھے....."

بڑی بی کی کہانیاں ہمیشہ اسی طرح شروع ہوتی تھیں۔ گرمی کے موسم میں چھڑکاؤ کئے ہوئے صحن میں تاروں بھرے آسمان کے تلے، یا کڑکڑاتے جاڑے میں لحاف میں لپٹے لپٹائے ـــــ ہر موسم میں بڑی بی اسی طرح اپنی کہانی شروع کرتی تھیں۔ اور ہم سب بچے حیرت اور خوشی سے آنکھیں پھاڑے ان کہانیوں کو کتنے شوق سے سنتے تھے۔ بادشاہ اور راجہ، سوداگر اور اس کی بیٹی، جن اور بھوت اور پریاں ـــــ کتنی عجیب مخلوق ان کہانیوں کی

دنیا میں بستی تھی۔

تاریخ کی ابتدا سے لے کر آج تک، چین سے لے کر جرمنی تک اور روس سے لے کر امریکہ تک، انسان کو کہانی سننے اور سنانے کا شوق ہمیشہ اور ہر جگہ رہا ہے۔ جب لکھنا پڑھنا ایجاد نہیں ہوا تھا تو ان زبانی کہانیوں کے ذریعے ہی تو انسان کے تجربات، محسوسات اور حادثات ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک پہنچتے رہے ہیں۔ اب بھی کہانیوں اور قصوں، ناولوں، ناٹکوں اور فلموں (اور یہ سب کہانی ہی کی مختلف قسمیں ہیں!) میں ہمیں اپنی سماج کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ مانا کہ کبھی کبھی یہ عکس دھندلا ہوتا ہے اور کبھی مسخ شدہ ـــــ جیسے مڑے ہوئے آئینوں میں انسان کبھی موٹا، کبھی لمبا نظر آتا ہے۔ اب یہ کہانی لکھنے والے پر منحصر ہے کہ اس کے آئینے میں سماج اپنے اصلی روپ میں نظر آتی ہے یا کسی دوسرے روپ میں۔ رومانی افسانہ نگار دنیا کو محبت اور پریم کے رنگ میں رنگا ہوا دیکھتا ہے، پرانی چال کے لکھنے والوں کے ہیرو فرشتہ صفت، ہیروئن حور مثال اور ولین (villain) شیطان کا نمونہ ہوتے تھے۔ مگر ترقی پسند حقیقت نگار تو دنیا کو اصلی رنگ میں دیکھنا اور دکھانا ہی پسند کرتے ہیں۔ ایسی دنیا جس میں انسان بستے ہیں ـــــ انسان جو اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ انسان جو باوجود "گناہ" کرنے کے انسانیت سے بے بہرہ نہیں ہو جاتے۔ انسان جو صرف

عشق و محبت ہی کے لئے نہیں زندہ رہتے بلکہ کھاتے بھی ہیں، کماتے بھی ہیں، گاتے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں قوم پر جان بھی قربان کرتے ہیں اور قوم سے غداری بھی کرتے ہیں۔ جو گرتے بھی ہیں، سنبھلتے بھی ہیں اور گرتے ہوؤں کو تھام بھی لیتے ہیں۔

ایسے گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان اگر آپ کو ان کہانیوں میں نظر آجائیں تو میری محنت وصول ہو گئی۔

اور اگر آپ سوال کریں کہ ان کہانیوں کا مقصد کیا ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ ان کا مقصد (بڑی بی کی کہانیوں کی طرح) بچوں کو (ہر عمر کے بچوں کو) سُلانے کے بجائے جگانا ہے کیونکہ یہ وہ دَور ہے جب بڑی بی کو کہانی یوں شروع کرنی چاہیئے: "جاگے سنسار اور....."

یہ کہانیاں مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ "فیصلہ"، "ایک لڑکی"، "پہلا پتھر"، "ناگن" اور "سرگشتی" دہلی کے رسالہ "ساقی" میں۔ "داروغہ صاحب" دَوراہوں کے "کلیم" میں۔ "ابابیل" رسالہ "جامعہ" میں۔ "تین عورتیں" خاص طور سے "نئے زاویے" کے لئے لکھی گئی تھی "معمار" اور "رادھا" دونوں "ادب لطیف" میں شائع ہوئی ہیں۔

بمبئی
۲۵۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

(خواجہ) احمد عباس

فیصلہ

بمبئی کی گجراتی اور مرہٹی چیخ پکار کے ہنگامہ میں شمالی ہند کے دو چار اُردو داں نوجوانوں کا کسی موقعہ پر اکٹھا ہونا ایک دلچسپ "حادثہ" ہوتا ہے۔ باقاعدہ تعارف کی رسم بھی غیر ضروری سمجھی جاتی ہے اور بے تکلف گفتگو فوراً چھڑ جاتی ہے۔ کل شام کا واقعہ ہے کہ ہم تین دوست ورلی کے مقام پر سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے گپ کر رہے تھے۔ مسئلہ زیرِ بحث "محبت" تھا۔ میں حسبِ معمول عشق کو ایک دماغی بیماری سے تشبیہہ دے رہا تھا۔ مجھے عاشقوں سے ایسی ہی ہمدردی ہے جیسی پاگل خانہ کے رہنے والوں سے، اور گو ممکن ہے کہ میں بھی کبھی اس مرض کا شکار ہوں۔ جیسے یہ ممکن ہے کہ مجھے نمونیہ ہو جائے یا میں پاگل ہو جاؤں۔ میرا یہ عقیدہ کہ عشق دماغی خرابی کی علامت ہے کبھی

کمزور نہ ہوگا۔ میرے اس نظریہ کی تردید میرے شاعر دوست سعید کمالی کر رہے تھے جو عشق کو زندگی کے خواب کی تعبیر اور کائنات کے نظام کی بنیاد سمجھتے تھے۔ اور موتی لال (جس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے) مجھے پریم کی ریت اور پریم کے راستوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مگر وہ کمالی کے شاعرانہ تخیل کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ موتی لال شادی کو محبت کی معراج سمجھتا تھا اس کے خیال کے مطابق قانونًا میاں بیوی کا رشتہ قائم ہوئے بغیر انسانی محبت مکمل نہیں ہو سکتی۔ کمالی زور شور سے موتی لال کی مخالفت کر رہے تھے۔ غالب اقبال اور عمر خیام، نظامی، کیٹس، شیلے کے اشعار اپنے نظریہ کے ثبوت میں پیش کر رہے تھے "محبت گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ شادی بیاہ سماج کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں۔ اور عشق ان کی قید سے آزاد ہے۔ عشق کو سماجی رسم و رواج کا پابند بنانا روح کو بیڑیاں پہنانا ہے۔" کمالی پورے جلال کے ساتھ اپنے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہریں زور شور سے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ "دیکھو یہ لہریں بھی میری تائید کر رہی ہیں۔" کمالی نے کہا۔ اسی وقت ایک غیر معمولی جسامت کی لہر آئی اور اتنے زور سے ساحل کی دیوار سے ٹکرائی کہ پانی کی ایک بوچھاڑ نے ہمیں بھگو دیا اور اپنا مقام چھوڑ کر ہم دوسری جگہ بیٹھنے پر مجبور

ہو گئے۔

ساحل تقریباً سنسان تھا۔ دو چار موٹریں دور، دور کھڑی تھیں جن میں شہر کے سیٹھ ہوا کھانے آئے تھے۔ ان کے علاوہ صرف ایک آدمی اور نظر آیا۔ وہ ہماری طرف آرہا تھا۔ شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ۔ ننگے سر۔ بال سمندر کی تند ہوا سے پریشان۔ "یہ تو کوئی اپنی طرف کا آدمی معلوم ہوتا ہے" موتی لال نے کہا۔ اور جب نووارد قریب سے گزرا تو کمالی نے اس کو "معاف کیجیے گا" کہہ کر ٹھہرالیا۔ کمالی کو بغیر جان پہچان ملاقات بڑھانے کا ملکہ ہے۔ "آپ تو ہماری طرف کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی خاص جلدی نہ ہو تو تشریف رکھیے یہ میرے دوست موتی لال ہیں اور یہ .... " ہمارا تعارف پورا کرتے ہی کمالی نے پوچھا۔ "اور آپ کی تعریف؟" نووارد نے جو کوئی تیس برس کا نوجوان تھا اپنا نام حامد بتایا اور کہا کہ وہ بمبئی کی سیر کی خاطر آیا تھا۔ اس کی شکل صورت معمولی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب افسردگی تھی گویا وہ دنیا کی ٹریجڈی کی تہ کو پاگیا ہو۔ دوسرے لحاظ سے وہ معمولی حیثیت کا پڑھا لکھا نوجوان معلوم ہوتا تھا۔

کمالی نے ہماری بحث کا خلاصہ حامد کو سنایا جو اب بے تکلفی سے ہمارے ساتھ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا: "آپ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے ہیں

آپ بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرما دیجئے۔"

نووارد ایک خشک اور کھسیانی سی ہنسی ہنسا اور ساتھ ہی ایک سکنڈ کے لئے کچھ گھبرا سا گیا گویا کسی نے اس کا کوئی اہم راز بھرے مجمع میں بیان کر دیا ہو، مگر بہت جلد ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور ایک نیا سگریٹ جلا کر کش لیتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ تینوں صاحبان ٹھیک کہتے ہیں۔"

ہم تینوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ تینوں مختلف عقیدے کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں؟

"اور شاید آپ سب غلطی پر بھی ہیں۔" حامد نے سمندر کی طرف نگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو کوئی ظریف فلاسفر معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ حامد ہم لوگوں سے مذاق کر رہا ہے۔

"معاف کیجئے گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ کچھ معمہ سا ہو گیا مگر حقیقت یہی ہے کہ میں آپ سب سے اتفاق بھی کر سکتا ہوں اور اختلاف بھی۔ مثلاً آپ کا کہنا صحیح ہے کہ محبت ایک دماغی بیماری ہے۔ مگر ایسی بیماری جس سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ شاعروں نے محبت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ دقیانوسی شاعروں نے محبت کا جو نظریہ پیش کیا

ہے وہ نفسیاتی، جسمانی اور سماجی حقیقتوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ مگر آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ کسی مرض کا بہترین علاج اس کی ہجو کرنا ہے۔ محبت کے موجودہ نظریہ کی ذمہ داری ہمارے سماجی حالات پر ہے۔ جس سماج میں ہزار میں سے ایک شادی بھی فریقین کی مرضی سے نہ ہوتی ہو۔ اور جہاں شہری عورتوں کی ایک بڑی تعداد پردے میں رہتی ہو۔ وہاں شاعر اگر خیالی معشوقوں سے محبت نہ کریں تو اور کس سے کریں اور آپ" اس نے کھائی سے مخاطب ہو کر کہا۔" آپ سچ کہتے ہیں۔ کہ محبت کو شادی بیاہ کی قید سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اور میرا نظریہ تو یہ ہے کہ انسانی ارتقا کی مکمل ترین منزل میں ہم سب قسم کے قوانین سے آزاد ہونگے۔ مگر موجودہ سماجی حالات میں موتی لال صاحب کا خیال صحیح ہے کہ شادی ہی محبت کو اصلیت کے معنی پہنا سکتی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں ان کے والدین اپنی اولاد کو ان کی مرضی کے خلاف شادیوں میں جکڑ دیتے ہیں۔ آزاد محبت کے خواب بیکاری کا مشغلہ نہیں تو کیا ہے؟ عشق و محبت پر بیکار خیالی محبت کرنے کے بجائے اگر آپ ہندوستانی نوجوانوں کو اپنی پسند پر شادی کرنے کا حق دلانے کے لیے جہاد کریں تو ہزاروں زندگیوں کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔"

اب ہمیں حامد کی گفتگو میں دلچسپی ہو چلی تھی۔ میں نے کہا۔" آپ بات بہت معقول کہہ رہے ہیں۔ اور شاید آپ اس نتیجہ پر اپنے ذاتی تجربہ سے پہنچے ہیں اگر کوئی ہرج نہ ہو تو کیا آپ ہمیں بھی اپنے راز میں شریک کر سکتے ہیں۔"

حامد کے چہرے پر پھر وہی گھبراہٹ کے آثار پائے گئے۔ گویا باتوں باتوں میں کسی نے اس کے پوشیدہ دلی جذبات پر سے پردہ ہٹا دیا ہو۔ "جی نہیں" اس نے اپنی گھبراہٹ کو دُور کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے تو عشق و محبت کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے البتہ میرے ایک عزیز دوست پر چند واقعات ایسے ضرور گذرے ہیں جو شاید اس مسئلے پر روشنی ڈال سکیں کیوں کہ تقریباً یہی واقعات ہر متوسط درجہ کے ہندوستانی مسلمان گھرانے میں پیش آتے رہتے ہیں اور شاید کسی حد تک یہی صورت حال ہندو گھرانوں میں بھی عام ہے"۔

ہمارے اصرار پر حامد نے اپنے دوست کا قصہ بیان کرنا شروع کیا اس کو جھوٹ بولنے کی عادت نہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ ہم فوراً ہی سمجھ گئے کہ اپنا عزیز دوست وہ خود ہے۔

میرا دوست (حامد نے بیان کیا) میرا ہی ہم نام بھی تھا دہلی کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے مرحوم والد پنجاب میں تحصیلدار تھے اور رشوت لینے میں کبھی نخل نہ کیا تھا۔ کافی جائداد چھوڑی تھی جس کی آمدنی سے حامد اور اس کی ماں فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے باپ اپنے زمانہ کے لحاظ سے خاصے تعلیم یافتہ تھے اور چونکہ سرکاری نمک کھایا تھا اس لئے اپنے لڑکے

کو بھی انھوں نے اعلیٰ تعلیم دلوائی تاکہ کوئی اچھی سرکاری نوکری مل سکے۔ غرض حامد مشن کالج میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ وہ ایک سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل لے کر آیا تھا۔ تاریخ، فلسفہ، معاشیات اور لٹریچر کی تعلیم نے اس کے خیالات میں فراست اور پختگی پیدا کر دی تھی وہ فطرتاً خاموش پسند اور سنجیدہ نوجوان تھا کالج کے دوسرے لڑکوں کی جنسی دلچسپیوں سے دور رہتا تھا۔ اس کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی جہاں پردہ شد و مد سے کیا جاتا تھا۔ اس کی ماں، خالہ یا رشتہ کی بہنیں کبھی باہر جاتی تھیں تو برقعہ پہننے پر بھی ٹانگہ پر چادر بندھوائی جاتی تھی اس کے مطالعہ اور تجربہ نے پردہ کے نقصانات کو اس پر واضح کر دیا تھا۔ لیکن بچپن سے ماں باپ کی اطاعت کا ایسا سبق پڑھایا گیا تھا کہ کبھی یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اپنے خیالات کا اظہار خود اپنے گھر میں کر سکے۔ غرض وہ ایسی دنیا میں رہتا تھا، جہاں غیر عورتوں کا جن میں وہ رومانی دلچسپی لے سکے نام بھی نہ تھا۔ اس کی کلاس میں دو چار لڑکیاں پڑھتی تھیں لیکن ان سے بات کرنے کی اس کو کبھی ہمت نہ ہوئی تھی ان کے علاوہ سوائے سینما کے روپہلی پردے اور بازار یا سڑک پر کسی بے پردہ عورت کی ایک جھلک دیکھ لینے کے وہ دوسری صنف سے بالکل ناآشنا تھا۔

پہلی لڑکی جس سے اُس کی ملاقات ہوئی بلقیس تھی۔ وہ اس کے کالج کے

ایک آزاد خیال پروفیسر عبدالرحیم کی اکلوتی لڑکی تھی اور ایف۔ اے میں تعلیم حاصل کرتی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم انگریزی ادب پڑھاتے تھے اور چونکہ حامد اپنے کلاس میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا اس میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ اس دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ پروفیسر عبدالرحیم اس قسم کے "آزاد خیال" لوگوں میں سے تھے جو اپنی بیویوں کو اس لئے پردہ سے باہر نکالتے ہیں کہ انگریزی اور فیشن ایبل سوسائٹی میں گھل مل سکیں اور بیٹیوں کو اس لئے پردہ نہیں کراتے تاکہ کسی آئی سی ایس سے شادی ہو جائے۔ پردہ توڑنے کے سماجی اور انسانی فوائد ان کے پیش نظر نہ تھے۔ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ ان کی بیوی ان کے ہمراہ کلب جا سکے۔ اور ان کی بیٹی کی شادی کسی آئی۔ سی۔ ایس یا اسی قسم کے دوسرے اعلیٰ سرکاری عہدہ دار سے ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حامد میں دلچسپی لیتے تھے ان کو یقین تھا کہ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں ضرور شامل ہوگا۔ اور قوی امید تھی کہ کامیاب بھی ضرور ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر انہوں نے ایک دن حامد کو اپنے ہاں چائے پر بلایا۔ پروفیسر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا تو وہ ابھی تیار نہ ہوئے تھے۔ بلقیس نے مہمان کا استقبال کیا۔ یہ حامد کے لئے پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی لڑکی سے دو بدو بات کی ہو۔ اسلئے قدرتی طور پر گھبرا رہا تھا۔ مگر بلقیس نے جو اٹھارہ برس کی عمر میں نہایت تیز اور ہوشیار تھی اس کو بہت جلد باتوں میں لگا لیا۔ گفتگو کے دوران میں نظر بچا کر حامد

بلقیس کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ شلوار، قمیص اور گلابی ڈوپٹہ میں کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سیاہ گھونگریالے بال اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں بلقیس کی خصوصیات تھیں۔ ان آنکھوں میں جانے کے لئے خاص دلکشی تھی۔ اس نے اتنی خوبصورت آنکھیں فقط ایک مرتبہ شکار میں ایک ہرن کی دیکھی تھیں۔ جبتک بلقیس اس سے باتیں کرتی رہی اور اس کے بعد جب پروفیسر اور انکی بیوی بھی شامل ہو گئے حامد کی نگاہیں بار بار بلقیس کیطرف اٹھتی رہیں جب حامد

پروفیسر عبدالرحیم نے ایک ادبی مسئلہ پر بحث چھیڑ دی تو بلقیس کی والدہ جن کی علمی قابلیت واجبی ہی واجبی تھی اُٹھ کر چلی گئیں لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔ گفتگو کے دوران میں حامد نے اس کی طرف نگاہ کی تو اس انداز میں وہ اور بھی بھلی معلوم ہوئی اپنے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں پر سہارا دیئے خاموش بیٹھی تھی۔ حامد کو فوراً خیال ہوا کہ اس طرح وہ ایک موتیا کی کلی سے کس قدر مشابہ تھی۔ چار پہنے کے بعد حامد رخصت ہوا تو بلقیس نے اُمید ظاہر کی کہ وہ آئندہ بھی کبھی کبھی ملتا رہے گا۔

اِس رات کو حسب معمول جب حامد کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھا تو اس کے دماغ میں شام کی یاد تازہ تھی۔ بار بار کتاب کے صفحے پر الفاظ سمٹ کر دو ہرن جیسی خوبصورت آنکھیں بن جاتے اور پھر وہی الفاظ پھیل کر ایک مسکراتا ہوا معصوم چہرہ بن جاتے جو موتیا کی کلی سے مشابہ تھا۔ اس رات حامد کی پڑھائی نہ ہو سکی۔

بلقیس سے اس ملاقات نے حامد کی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا کر دیا۔ اِس کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دُنیا کی تنہائی اور اندھیرے میں کسی رفیق نے اِس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔ جتنے لڑکے اس کے دوست تھے اُن کی صحبت میں اس کو اب وحشت ہونے لگی۔ وہ بھدے اور بھونڈے مذاق کرتے تھے۔ اس کی قدرتی جھینپ اور سادہ لوحی پر ہنستے اور معاشرتی مسائل پر اس کے سنجیدہ خیالات کو حماقت خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک طالب علم کی زندگی کا مقصد کرکٹ کھیلنا، اچھے کپڑے پہننا اور دنیا کی ہر لڑکی کے متعلق بھی ناشائستہ انداز میں رائے زنی کرنا تھا۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حامد کی آمد و رفت پروفیسر عبدالرحیم کے ہاں ہے تو اُنھوں نے اِس کے اور بلقیس کے متعلق بھی پست مذاق کرنا شروع کیا جو حامد کو سخت ناگوار گذرا۔ اِس کو معلوم تھا کہ مذاق کی تہ میں حسد ہے کہ بلقیس اِن لوگوں کے بجائے حامد جیسے سیدھے اور کم رو شخص میں کیوں دلچسپی لیتی ہے لیکن پھر بھی لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ نے اِس کو دل میں اپنے اور بلقیس کے تعلقات کی جانچ کرنے پر مجبور کر دیا۔ بلقیس سے ملتے اِس کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا اِس عرصہ میں اِن کو ایک دوسرے میں کافی دلچسپی ہو چلی تھی۔ گو بلقیس کے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کو منہ نہ لگاتی تھی برخلاف اِس کے وہ حامد کا خاص خیال رکھتی تھی۔ حامد کو سیاسیات اور سماجی مسائل سے خاص شغف

تھا۔ اس کی خاطر بلقیس نے بھی جو اب تک کالج کی دوسری لڑکیوں کی طرح ملکی سیاست سے نابلد تھی ان مسائل میں دلچسپی لینی شروع کی۔ حامد کے مشورہ سے سنجیدہ لٹریچر کا مطالعہ کیا اور دل ہی دل میں حامد کی شکر گذار ہوئی کہ اس نے ایسی زبردست اور دلچسپ دنیا کا دروازہ اس کے لئے کھول دیا ہے۔

حامد کے دل میں بلقیس کی شخصیت آہستہ آہستہ گھر کرتی گئی۔ گو اگر اس سے کوئی کہتا کہ اس کو بلقیس سے محبت ہے تو وہ فوراً اس کی تردید کر دیتا لیکن یہ واقعہ تھا کہ اس سے ملنے کی خاطر وہ دنیا کے بڑے سے بڑے کام کو ملتوی کر دیتا۔ وہ بلقیس سے اپنے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتا۔ اپنی اُمیدیں، ارادے، اُمنگیں سُناتا اور جب ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ بلقیس اِس کی باتیں سُنتی وہ اس کو کہیں اور نہ نصیب ہو سکتی تھیں۔ مگر کیا اِس کو بلقیس سے محبت تھی؟ یہ وہ سوال تھا کہ اکثر اِس کو پریشان کرتا تھا۔ یہ واقعہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ ایک دوسرے کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ حامد ٹینس ٹورنامنٹ جیتا تو بلقیس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور بلقیس امتحان میں اوّل آئی تو حامد نے محسوس کیا گویا یہ خود اُس کی کامیابی تھی۔ کیا اسی کا نام محبت ہے؟ اِس کا حامد فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ عشق کے عام لیلیٰ مجنوں والے مفہوم کا قائل نہ تھا۔ اِس کو یقین تھا کہ اگر بلقیس کو اِس سے ملنے کی ممانعت کر دی گئی تو قیسِ نجد کی طرح وہ مارا مارا نہ پھرے گا۔ مگر پھر بھی

اگر بلقیس سے ملے اِس کو ایک ہفتہ ہو جاتا تو وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا۔ کبھی کبھی اِس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ کیا وہ بلقیس سے شادی کر کے اِس کو تمام عمر کے لئے اپنی رفیق بنا سکے گا۔ مگر اپنے خاندانی حالات اِس کی نظر کے سامنے تھے اور یہ نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اِس کے گھر والے ایک بے پردہ لڑکی کو بہو بنانے پر رضامند ہو جائیں۔ اِسی اُلجھن میں وہ دل کو یوں بھی سمجھاتا کہ شاید بلقیس کے دل میں اِس کے لئے دوستی کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ ہی نہیں ہے۔ اور آخر اِس میں ایسی کون سی خوبی تھی جس کے لئے بلقیس اِس سے محبت کرے؟ ایسی حالت میں اِس سے شادی کرنے کا خیال بھی دل میں لانا بے کار تھا۔

اِسی زمانہ میں ایک ایسا واقعہ ہوا۔ جس نے حامد کے دلی سوالات کا جواب دے دیا۔ مگر ساتھ ہی اِس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

ہوا یہ کہ حامد ملیریا میں مبتلا ہو کر بیمار پڑا۔ لاپرواہی کی بدولت ملیریا ٹائیفائڈ میں تبدیل ہو گیا۔ دو ہفتہ تک کالج ہی جا سکا اور نہ بلقیس ہی سے مل سکا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ پرچہ لکھ کر بھیج دے۔ مگر ماں کے خوف سے خاموش رہا۔ اِس کو معلوم تھا اِس کی ماں بے پردہ لڑکیوں کے خلاف ہے اور اگر اِس کو معلوم ہو گیا کہ اِس کے لڑکے کی دوستی بلقیس کے ساتھ ہے تو وہ از حد خفا ہو گی اور ممکن ہے کہ آئندہ ملاقات کو حکماً بند کر دے۔ اِس معاملہ میں حامد اپنی ماں سے بحث نہ کر سکتا تھا۔ صدیوں

سے اُس کے خاندان کی عورتوں کو یہی تعلیم دی گئی تھی کہ پردہ مذہب و ایمان کا جزو ہے اور شرافت کی نشانی ہے۔ دو ایک بار اس نے اپنی دبی زبان سے پردہ کے خلاف آواز اُٹھانے کی کوشش کی تھی مگر ہر دفعہ اس کی ماں نے اِس قدر سختی کے ساتھ ڈانٹا کہ اب ہمت نہ پڑتی تھی کہ بے پردگی کی حمایت میں ایک لفظ بھی نکال سکے۔ جب اِس کو بخار آئے آٹھ دن ہو گئے اور بلقیس کو کالج میں معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے تو اُس سے نہ رہا گیا اور اپنے باپ سے اجازت لے کر وہ حامد کو دیکھنے اُس کے گھر پہنچی۔ بلقیس کو آتے دیکھ کر حامد حیران رہ گیا۔ اُس کو یہ نہ معلوم تھا کہ وہ لوگوں کے کہنے سُننے کی پرواہ کئے بغیر اِس سے ملنے کی خاطر تنِ تنہا چلی آئے گی۔ اِدھر ان اِس کا بخار ہلکا تھا۔ اپنی صحت کا یقین دلا کر بلقیس کو جلدی ہی رخصت کر دیا۔ لیکن اِس وقت پہلی بار معلوم ہوا کہ اِس کو بلقیس سے اور بلقیس کو اِس سے محبت ہے۔

بلقیس گھر سے نکلی تھی کہ گھر کی ماما گلابو نے حامد کی اماں سے ہنس کر کہا:۔

"لو بہو خود ہی گھر دیکھ گئی۔ مبارک ہو"

اس کا یہ کہنا ہی تھا کہ حامد کی اماں (جو ابتک دوسرے کمرے میں بیٹھی تھیں گویا بے پردہ لڑکی کی شکل دیکھنا بھی ان کو ناگوار تھا) اس پر برس پڑیں: خبردار جو ایسی بات منہ سے نکالی ہو۔ فوج یہ فرنگن میری بہو بنے۔ نہ لحاظ نہ شرم میرے گھر میں ایسی لڑکیوں کا گذر نہ ہوگا،

حامد کو آج اندازہ ہُوا کہ باوجود اپنی اور تمام خوبیوں کے اسکی ماں پردے کے معاملہ میں کس قدر متعصب ہے۔ یہ اس کو ہمیشہ سے معلوم تھا کہ وہ پردہ کی سخت حامی ہے اور بے پردگی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لئے اس نے بلقیس سے اپنی دوستی کو گھر والوں سے چھپایا تھا۔ اس کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس کا تعصب اس حد تک بڑھا ہُوا ہے کہ وہ ایک شریف اور معصوم لڑکی کی مخالف فقط اس بنا پر ہو جائے گی کہ وہ متوسط درجے کے رواج کے مطابق برقعہ نہیں پہنتی۔ یہ تو انتہائی بے انصافی اور صریح ظلم تھا۔ حامد کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت ماں سے بحث کرے۔ اس کو قائل کرے کہ پردہ نہ مذہب کا جزو ہے نہ عصمت کا محافظ بلکہ ایک بیکار رواج ہے جس کی بدولت لاکھوں عورتیں دِق۔ اِختلاجِ قلب اور دوسرے مہلک امراض میں مبتلا ہیں۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ بلقیس کی خوبیوں، اس کے اخلاق، اس کی انسانی ہمدردی، اِس کے ایثار۔ اس کی اخلاقی جرأت کا ذکر کرے اور اپنی ماں کو اِس لڑکی کی عزت کرنے پر مجبور کرے لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بے کار ہوگا۔ اس کی ماں اپنی عمر کے لحاظ سے اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔ عقلمند اور دانا خاتون تھی تمام محلہ والوں سے اِس کا برتاؤ ایسا تھا کہ سب اِس کی عزت کرتے تھے۔ غریبوں کی پرورش، ضرورت مندوں کی امداد کے لئے وہ کبھی دریغ نہ کرتی تھی۔ ہر ایک سے خواہ وہ گھر کی مہترانی ہی کیوں نہ ہو خندہ پیشانی سے پیش آتی۔ کسی کا دُکھ اِس

سے دیکھا نہ جاتا تھا اور اگر وہ کسی کو سکھ پہنچا سکتی تو کبھی اپنی تکلیف کا خیال نہ کرتی۔ روپیہ پیسہ محنت ہمدردی جس طرح بھی ممکن ہوتا دوسروں کو راحت پہنچانے کی کوشش کرتی۔ اِس کی زبان سے کسی کے لئے آج تک کوئی بُرا لفظ نہ نکلا تھا لیکن تنگ نظر مذہبی تعلیم اور رواج کی غلامی نے اِس کو اور اِس قسم کی دوسری عورتوں کو پردے کے معاملہ میں اوّل درجہ کا متعصب بنا دیا تھا۔

اِن کی حالت اِس چینی قیدی کی مانند تھی جس کو چالیس سال تک اندھیری کوٹھری میں قید رکھنے کے بعد جب رہا کیا گیا تو سورج کی روشنی سے اِس کی آنکھیں اِس قدر چکا چوند ہو گئیں کہ اِس نے گڑگڑا کر درخواست کی اِس کو پھر اِسی کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ اس کو اپنی ماں کے خلاف کوئی غصہ نہ تھا۔ ایسے قیدی پر کیا غصہ کیا جائے جو اپنی بیڑیوں اور ہتھکڑیوں سے محبت کرے اور اِن کو اپنے لئے باعث آسائش سمجھے لیکن حامد کے دل میں بے پناہ غصہ تھا اِس رواج اور اِن رسوم کے خلاف جو اِس جہالت اور ظلم کے لئے ذمہ دار تھیں۔ گھنٹوں وہ بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح اس کا ملک اس پردہ کی لعنت سے پاک کیا جا سکتا ہے لیکن پھر جب اِس نے اپنے اور طیبہ کے آئندہ تعلقات کے مسئلہ پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہوا کہ وہ اپنی ماں کو ناراض نہیں کر سکتا۔ وہ ضعیف تھی۔ بیمار تھی اور اس کو اپنے لڑکے سے از حد محبت تھی۔ اِس نے اپنی زندگی میں کوئی سکھ نہ

پایا تھا۔ رواج کے مطابق شوہر سے اکثر علیحدہ رہی۔ اِس لئے کبھی زوجیت کے خوشگوار تعلقات پیدا نہ ہو سکے۔ کئی اولادیں نادانی اور جہالت کے باعث بچپن ہی میں مرگئیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس کا کوئی تھا تو حامد تھا۔ وہ حامد بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو چھوڑ نہ سکتا تھا۔ اِس کے علاوہ اپنی ماں کے موجودہ رویہ کے ہوتے ہوئے بلقیس سے تعلقات قائم رکھنا اور اِس سے شادی کرنا اس لڑکی کے ساتھ بھی بے انصافی تھی۔ حامد کو یہ گوارا نہ تھا کہ اپنی عزیز ترین دوست کو ایسے گھر کی بہو بنائے جہاں اِس کی عزت نہ کی جاتی ہو۔ لیکن کیا انصاف کی رُو سے وہ بلقیس کی محبت کو اپنی ماں کی محبت پر قربان کر کے اس طرح ٹھکرا سکتا تھا۔ جس لڑکی نے اِس جیسے غیر دلچسپ خشک اور کم رُو انسان کے لئے اتنا کچھ کیا ہو۔ اِس کی زندگی میں پہلی بار دوسری جنس کی رفاقت کے لطیف عنصر کو داخل کیا ہو۔ اس کی خاطر ورجنوں سکیل، حسین اور امیر لڑکوں کی پرواہ نہ کی ہو..... کیا اِس کے ساتھ ایسا سلوک جائز تھا۔ تمام رات اِسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہا۔ ماں کی محبت یا بلقیس کی محبت؟ ان میں سے ایک کو بھی وہ قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

صبح ہوتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کی ان دو محبوب ترین ہستیوں کی محبت پر اپنی غیرت اور اپنی شخصیت قربان کر دے گا۔

بخار سے صحت ہونے پر جب حامد کالج واپس آیا تو بلقیس نے اس

کے برتاؤ میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ اس نے اب پروفیسر عبدالرحیم کے گھر جانا بند کر دیا۔ کبھی بلقیس ملتی تھی تو بدتمیزی سے منہ موڑ کر کسی اور سے باتیں کرنے لگتا، دوسری لڑکیوں میں زبردستی گھس کر بیٹھتا اور عام لڑکوں کی طرح بھدے مذاق کرتا۔ وہ حامد جو کبھی پارسائی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اب باقاعدہ شریروں میں شمار ہونے لگا۔ آوارہ لڑکوں کے ساتھ گانے والیوں کے کوٹھوں پر جانا شروع کر دیا۔ سال کے اخیر تک حامد کی آوارگی کا سکہ جم گیا۔ امتحان میں ذلت کے ساتھ فیل ہوا۔ مگر حامد نے دل میں ایسا محسوس کیا گویا اس نے دنیا کے سب سے بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب بلقیس کو اس سے محبت کی بجائے نفرت ہو گئی تھی۔ اس عرصہ میں حامد اور بلقیس کے تعلقات کا رنگ یکایک بدل جانے پر کالج کے حلقوں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں — افترا پردازوں، حاسدوں اور بلقیس کے ناکام عاشقوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ بعض تو یہ بھی کہتے تھے کہ حامد کی سابقہ پارسائی فقط ایک دکھاوا تھی۔ تاکہ بلقیس پر اپنا اثر جما سکے اور "مطلب نکل جانے کے بعد" وہ اپنی اصلیت پر واپس آ گیا تھا۔ کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ بلقیس بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک آئی۔ سی۔ ایس شوہر کی تلاش میں تھی۔ حامد جیسے لائق طالب علم سے اس کو امید تھی کہ وہ ضرور سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہو گا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ حامد سرے سے سرکاری ملازمت ہی

کے خلاف ہے تو اِس نے ایسے بے کار آدمی کو دھتا بتائی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بلقیس کا کالج آنا مشکل ہو گیا اِس نے اپنا نام کٹا لیا۔ حامد کی طرف سے نا اُمید ہو کر جس کو وہ خلوص اور وفاداری کا پُتلا سمجھتی تھی۔ بلقیس مردوں کی ذات سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو گئی تھی اب کسی دوسرے سے محبت کرنا اِس کے لئے ناممکن تھا مگر کچھ عرصہ کے بعد سُنا گیا کہ "زبانِ خلق" کے حملوں سے بچنے کے لئے اور اپنے باپ کے اصرار پر اِس نے ایک فوجی لفٹنٹ سے شادی کرنا منظور کر لیا۔

اِتنا کہہ کر حامد رُک گیا اِس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ قصہ سُنا کر اِس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

"اِس کے بعد؟" موتی لال نے خاموشی کو توڑا۔

اِس کے بعد، حامد نے کہنا شروع کیا "اِس ٹریجیڈی کا آخری باب شروع ہوا۔ جس لفٹنٹ سے بلقیس کی شادی ہوئی وہ اوّل درجہ کا شرابی اور دو مہلک پوشیدہ بیماریوں میں مبتلا تھا ایک سال ہوا..... اِس کی آواز مشکل سے نکلتی تھی اور وہ زمین کی طرف مجرمانہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی قتل کا اقبال کر رہا ہو؟" ایک سال ہوا وہ دونوں اِن مرضوں کا شکار ہوئے

حامد کی ماں نے اس کی شادی ایک رشتہ دار لڑکی سے کر دی جو دائم المریض تھی۔ اور جس کے متعلق ڈاکٹروں کا فیصلہ تھا کہ وہ ازدواج کا بوجھ نہ سنبھال سکے گی مگر خاندانی لال بجھکڑوں نے ڈاکٹروں کی رائے کو ہذیان سمجھا اور اُلٹا فتویٰ دے دیا کہ شادی تو ایسی اکسیر ہے جس سے تمام مرض دُور ہو جاتے ہیں۔ حامد جو دل میں اس شادی کے از حد خلاف تھا ماں کے ارادے کے مقابلے میں اپنی آواز اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اِس کے علاوہ بلقیس سے قطع تعلق کے بعد اِس نے طے کر لیا تھا کہ اِس کی ماں اگر کسی اندھی، کانی، لنگڑی، لولی لڑکی سے بھی اس کی شادی طے کرے گی تو وہ اس کو بھی منظور کر لے گا۔ اِس کی حالت عجیب تھی۔ اِس نے رواج پرست سماج سے ہار مانی تھی۔ جو چیز اِس کے لئے بلقیس کے چھُٹ جانے سے بھی کہیں زیادہ ناقابل برداشت تھی وہ یہ احساس شکست تھا۔ سماج اس کو ایک بے پناہ سمندر معلوم ہوتی تھی جس کی خوفناک موجوں میں ہر انسان کی انفرادی شخصیت اور ہر انقلابی ذہنیت کے لئے موت کا سامان ہے وہ اِن جوانمردوں میں سے نہیں تھا جو اپنی ہمت کے سہارے سماج کے ساگر کو پار کر کے اپنے خیالات کی بنیادوں پر نئی دُنیا بساتے ہیں۔ وہ فطرتاً کمزور تھا۔ دنیا کے بزدلوں کی طرح اس نے چند تھپیڑوں سے پریشان ہو کر چپّو پھینک دیئے۔ اب اس کی کشتی بھنور میں تھی اور اِس کے ساتھ دوسروں کی کشتیاں بھی۔

"سکینہ جس کو اپنی شادی طے کرنے میں کوئی دخل نہ تھا۔ جب حامد کی بیوی بن کر آئی تو اس نے شریف لڑکیوں کی طرح شوہر کی ہر طرح خدمت کرنے کی کوشش کی۔ مگر جس کے دل کا شیشہ ایک بار ٹوٹ جائے وہ پھر نہیں جُڑ سکتا۔ حامد نے اپنی بیوی سے کبھی سیدھے مُنہ بات نہ کی وہ بیچاری بیمار ہمیشہ سے تھی چھ ماہ بعد اِسی غم میں گھُل کر مرگئی۔ حامد کی ماں بھی کچھ عرصہ بعد چل بسی۔ اکثر پردہ دار عورتوں کی طرح اس کو دِق کا مرض مدت سے تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد وہ فقط اِس اُمید پر زندہ تھی کہ حامد کا سہرا دیکھے۔ بیٹے کی آوارگی کو اِس نے ناکتخدائی کی بدعنوانیوں پر محمول کیا۔ اور جتنی جلدی ممکن ہو سکا اِس کی شادی سکینہ کے ساتھ کردی۔ لیکن اِس کو کیا معلوم تھا کہ حامد کو جو مرض لاحق تھا اِس کا علاج اِتنا آسان نہ تھا۔ جب شادی کے بعد بھی اِس نے دیکھا کہ حامد کی حالت بہتر نہ ہوئی تو اِس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی ایسا ہونہار لڑکا جس سے اِس کو اور تمام خاندان والوں کو بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں یوں دیکھتے دیکھتے تباہ ہوا جارہا تھا ایک بار فیل ہونے کے بعد کالج سے اِس نے ہمیشہ کے لئے نام کٹا لیا تھا۔ باوجود رشتہ داروں کے اصرار کے اِس نے سرکاری نوکری کے لئے کوشش کرنے سے انکار کردیا۔ شراب نوشی اور کوٹھوں پر جانا جو اِس نے بلقیس کا دل اپنی طرف سے پھیرنے کے لئے شروع کیا تھا اِس کی مستقل عادت بن چکا تھا۔ ماں نے لاکھ کوشش

کی سمجھایا۔ ڈانٹا لیکن حامد کی حالت نہ سنبھلی۔ بیٹے کی طرف سے مایوسی نے بڑھیا کا دل توڑ دیا اور وہ بیچاری بغیر یہ جانے کہ اپنے بیٹے کی زبوں کی حالت کی ذمہ دار بھی خود تھی اِس دنیا سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئی۔ مگر اِس کی موت نے حامد کے دل میں یہ خوفناک سوال پیدا کر دیا کہ کیا وہ خود اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار تھا؟ کیا اِس نے ایک بے پردہ بہو کے صدمہ سے بچا کر اس کو اِس سے بھی بڑا صدمہ اپنی آوارگی سے نہ پہنچایا تھا۔ جو قربانی اِس نے اپنی ماں کی محبت کی خاطر کی تھی اب بے کار نظر آنے لگی۔ اِس کو یہ بھی شبہ ہوا کہ بلقیس سے قطع تعلق اِس نے ماں کی خاطر سے نہیں شاید سماج کے خوف سے کیا تھا اور ساتھ ہی اِس کو اِس خیال نے بھی ستایا کہ ممکن ہے بلقیس اور اپنی بیوی کی موت کے لئے وہ خود ہی ذمہ دار ہو۔ اگر اس نے پرلے درجہ کی کمزوری دکھانے کی بجائے ہمت سے کام لیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ اِن تینوں میں سے ایک جان بھی ضائع نہ ہوتی ——

اِسی خیال نے اِس کو تقریباً پاگل بنا دیا۔

رات اور دن اِس کا ضمیر اِس کو الزام دیتا تھا۔ وہ اتنا پریشان ہو گیا کہ رہی سہی جائداد بیچ کر آوارہ گردی کو نکل گیا کہ شاید سفر سے دل کو سکون حاصل ہو دہلی سے کلکتہ، کلکتہ سے مدراس، مدراس سے بمبئی، لیکن اِس بھیانک خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔

ہم لوگ حامد کی کہانی بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اور جب اس نے تھک کر بولنا بند کیا تو اس کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی پسینہ میں شرابور وہ اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے شکاری کتوں سے گھر کر ہرن موت کیلئے تیار ہوتا ہے۔ جب ہماری گفتگو شروع ہوئی تھی تو ہمیں یہ خیال بالکل نہ تھا کہ ایک اجنبی پہلی ملاقات میں اپنی زندگی کی داستان سُنا ڈالیگا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنی کہانی سنانے کیلئے اس قدر بیتاب تھا کہ ذرا سے بہانے پر اس نے تین غیر متعارف شخصوں کو شروع سے اخیر تک تمام تفصیلات سنا ڈالیں

"تو کیا وہ کسی فیصلے پر پہنچ سکا؟" کمالی نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سوال کیا۔

"ہاں" حامد نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ جیسے عدالت میں فیصلہ سُنایا جاتا ہے:۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مجرم تھا۔"

اور یہ کہتے ہی وہ اُٹھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ جبتک ہم میں سے کوئی آواز دے سکے وہ کافی دور نکل گیا۔

کمالی نے کہنا شروع کیا۔ "عشق جو کائنات کی بنیاد اور رمزِ حیات کی اصلیت ہے سماج کے وقتی حالات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔۔۔۔۔"

لیکن وہ دفعتہً رُک گیا۔ اس وقت شاید خود اسکو بھی ان شاعرانہ الفاظ کے

کو کھلے اور لو ہونے کا احساس تھا۔

اِس عرصہ میں حامد دُور ایک نقطہ کی مانند نظر آ رہا تھا۔ محیطِ کائنات میں ایک بے حقیقت نقطہ۔ چند ہی لمحہ میں وہ نقطہ بھی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ پھر ساحل پر وہی سناٹا تھا اور سورج ایک خونیں سمندر میں ڈوب رہا تھا۔

ایک لڑکی

(اس کہانی میں کوئی کیریکٹر قطعی فرضی نہیں ہے)

(۱)

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں سنہ ۲۰۱۳ء یادگار رہے گا۔ کیونکہ اس سال ہندوستانی مسلمانوں کے واحد دارالعلوم میں سرکاری طور پر مخلوط تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ یہ قصہ بھی عجیب ہے کہ کس طرح یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اس سنسنی خیز تبدیلی کے لئے قانوناً مجبور کئے گئے۔ ننانوے ۹۹ سال پہلے ہندوستان کے مشہور قوم پرست جرنلسٹ اور سماجی کارکن سلیم الزماں صحافی نے مسلم یونیورسٹی ممبرانِ کورٹ واگزکٹو کونسل کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا تھا جس میں ان بزرگان قوم پر قومی امانت کے خلاف ناجائز مصرف کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔

سلیم الزمان صحافی کا دعویٰ تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جتنا روپیہ جمع کیا گیا تھا وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے تھا نہ کہ فقط مسلمان لڑکوں کی تعلیم کیلئے اور حکومت نے جب یونیورسٹی کا چارٹر منظور کیا تھا تو اس میں بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ یونیورسٹی تمام مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم کی جاتی ہے یہ کہیں تخصیص نہ کی گئی تھی۔ کہ مسلمانوں سے مراد فقط مسلمان مرد ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں سلیم الزمان صحافی نے مشہور زباندانوں کا فیصلہ پیش کیا تھا کہ لفظ "مسلمان" عورتوں اور مردوں دونوں کیلئے یکساں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اُس نے مقتدر علماء دین سے بھی ایک فتویٰ حاصل کیا تھا جس میں اُنہوں متفقہ طور پر اعلان کیا تھا۔ کہ گو اکثر مسلمان مردوں پر کسی نہ کسی مولوی نے کبھی نہ کبھی کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ لیکن عورتوں کو ایک جماعت کی حیثیت سے اس وقت تک اسلام سے خارج نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر سلیم الزمان صحافی کا دعویٰ تھا کہ اتنے عرصے تک یونیورسٹی کے دروازے لڑکیوں کیلئے بند رکھ کر ممبران کورٹ و اگزیکٹو کونسل قومی روپے کے ناجائز استعمال کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ مقدمہ جب یکم اپریل ۱۹۳۸ء کو پہلی بار علی گڈھ کے کلکٹری عدالت میں پیش ہوا تو تمام ملک میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ مسٹر جناح کی مسلم لیگ، سر ہائی نس آغا خاں کی مسلم کانفرنس، مولانا شوکت علی کی خلافت کمیٹی، مولوی مظہر الدین کی جمعیتہ العلماء، صدر یار جنگ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر خالص اسلامی انجمنوں نے

تیرہ ہزار دو سو ستادن جلسے کئے جن سب میں کل تعداد حاضرین کی تیرہ ہزار ایک سو پچاس نفوس تھی۔ اس کے علاوہ سلیم الزماں صحافی پر ستائیس مفتیوں نے کفر کے فتوے لگائے اور سترہ اخباروں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس سے روپیہ لے کر کھا گیا ہے۔ مسٹر جناح سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے چودہ نکات میں ایک پندرہویں نکتے کو اور شامل کر لیں کہ ازل سے لے کر ابد تک مُسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کبھی جاری نہ کی جائے گی۔

سیٹھ اللہ دیا کی صدارت میں مسٹر محمد علی جناح نے بھنڈی بازار، بمبئی کے مُسلمانوں کو خالص انگریزی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "گو میں ایک علامہ نہیں ہوں مگر سلیم الزماں صحافی کی ہندو پرست حرکت کی سخت مذمت کرتا ہوں" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مُسلمان کی حیثیت سے وہ مُسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کے اجراء کے سخت خلاف ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنی صاحبزادی کو کبھی علی گڑھ بھیجنے کا خیال بھی نہ کیا اور یورپ کے مخلوط اداروں میں تعلیم دلوائی۔ آخر میں آپ نے پانچ ہزار روپے روز پر اپنی قانونی خدمات یہ مقدمہ لڑنے کے لئے مسلم یونیورسٹی کو پیش کیں۔ جس پر بھنڈی بازار کے مُسلمانوں نے "اللہ اکبر" کے نعرے بلند کئے کیونکہ انگریزی سے ناواقف ہونے کے باعث وہ سمجھتے تھے کہ مسٹر جناح نے بے کار و بے روزگار مسلمانوں کو فاقے سے بچانے کے لئے پانچ ہزار

روپے چندے کا اعلان کیا ہے اس جلسے کے بعد مسٹر جناح نے ایک بیان شائع کیا کہ جب تک کانگریس اپنے گرگوں سے ایسے مقدمے دائر کراتی رہے گی وہ کانگریسی لیڈروں سے فرقہ دارانہ مصالحت کی گفتگو نہ کرینگے اور یہ بھی کہا کہ بھنڈی بازار کے جلسے نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلم عوام بھی اس رائے میں مسٹر جناح کے ہم خیال ہیں۔ اس بیان کی تائید سر ابوالبقار اور سر امین خاں نے کی۔ جنھوں نے کہا کہ نہرو رپورٹ کے بعد یہ مقدمہ مسلمانوں کی قومی زندگی پر کانگریس کا دوسرا حملہ ہے۔

یہ تھی زبردست ابتدا اس مقدمے کی جو ننانوے برس تک مختلف عدالتوں میں چلتا رہا اور اس عرصہ میں تیرہ مرتبہ پریوی کونسل میں پیش ہوا۔ علیم الزماں صحافی کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے رحیم الزماں صحافی نے اس مقدمے کو جاری رکھا اور اس کے بعد اس کے لڑکے کلیم الزماں صحافی نے۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں کئی انقلابات ہوئے اور حکومتیں تبدیل ہوئیں لیکن مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوا۔

۲۰۳۵ء میں جب کلیم الزماں صحافی کا انتقال ہوا تو یہ مقدمہ ورثے میں اس کی اکلوتی بیٹی سلمہ صحافی کو ملا۔ اگلے ہی سال جب تیسری سوراج حکومت قائم ہوئی تو اس نے فوراً طے کر دیا کہ مسلم یونیورسٹی کے افسران کو لڑکیوں کا داخلہ روکنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر انھوں نے اپنا یہی طرزِ عمل جاری رکھا تو حکومت یونیورسٹی

کی عمارتیں ضبط کرکے وہاں ایک چڑیا گھر قائم کردے گی۔

اِس فیصلہ پر مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی یونین نے مُبارک باد کا ریزولیشن پاس کیا۔ ہارون ناصری کی تجویز اور حامد عباسی کی تائید پر بجٹ میں دو سو روپے خواتین طالب علموں کے بیٹھنے کے لئے مخملی صوفوں کے واسطے منظور کئے، لیکن ایک سال تک وہ مخملی صوفے بے کار پڑے رہے کیونکہ کوئی لڑکی داخل نہ ہوئی علماء نے فتوی دیدیا تھا کہ مخلوط تعلیم حرام ہے اور مشکل یہ تھی کہ قدامت پسند گھرانوں نے ان فتووں کے ڈر سے اپنی لڑکیاں نہ بھیجیں اور جو آزاد خیال لڑکیاں تھیں وہ علی گڈھ جیسی فرقہ پرور اور پُرانے خیال کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے خلاف تھیں۔ آخر کار، گو وہ بھی اِس دقیانوسی تعلیم کے خلاف تھی جو علی گڈھ میں دی جاتی تھی، اگلے سال خود سلمہ صحافی کو دارد ھا کی قومی یونیورسٹی چھوڑ کر علی گڈھ میں داخلہ لینا پڑا تاکہ اپنے صنف کا حق قائم کرے۔

جس وقت سلمہ صحافی کے داخلہ کا فارم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مولوی ابوالعلم کے پاس پہنچا تو وہ سخت پریشان ہوئے اور دوڑے وائس چانسلر شیخ رحیم الدین کے پاس گئے۔ وہ دونوں مخلوط تعلیم کے سخت خلاف تھے لیکن سلمہ صحافی کا داخلہ کرنے سے انکار کرنا حکومت کے فرمان کی خلاف ورزی تھی۔ "اس کمبخت لڑکی کو داخل کرنا ہی پڑے گا" مولوی ابوالعلم بولے۔ "لیکن طالب علم لڑکیوں کے لئے کچھ

ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے گھبرا کر وہ یونیورسٹی میں داخلے کا خیال ہی چھوڑ دیں"
اگلے روز یونیورسٹی کی اگزیکٹو کونسل کا جلسہ منعقد ہوا تاکہ صورتِ حال پر غور کیا جائے
نواب طاؤس یار جنگ اچکانی نے تجویز پیش کی کہ طالب علم لڑکیوں کے لئے ایک خاص
بورڈنگ ہاؤس تعمیر کیا جائے۔ جس کی دیواریں دو سو بیس گز اونچی ہوں اور اِس
بورڈنگ سے لے کر لکچر کے کمروں تک ایک سُرنگ بنائی جائے جس کے ذریعہ سلمہ
صحافی لکچر سُننے جایا کرے۔ اِس کے علاوہ ہر لکچر روم میں چاروں طرف سے ایک بند کوٹھری
بنائی جائے جس میں سرنگ کا راستہ نکلتا ہو اور اِس کوٹھری میں بجائے دروازے
یا کھڑکی کے چار باریک سوراخ ہوں جن میں سے پروفیسر کی آواز پہنچ سکے۔ اِس
تجویز کی زبردست موافقت مولانا لقمان نے کی اور بالاتفاق رائے منظور ہو گئی
اس کے بعد پروفیسر عبدالصدیق رشیدی نے تجویز پیش کی کہ جس طرح طالب علم
لڑکوں کے لئے سیاہ بند گلے کا کوٹ اور اٹھارھویں صدی ترکی کی ٹوپی پہننا لازمی
تھا اسی طرح طالب علم لڑکیوں کے لئے کالا برقعہ پہننا لازمی قرار دیا جائے۔ یہ تجویز
بھی منظور کر لی گئی۔ اب خداوندانِ یونیورسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اُن کو یقین
تھا کہ سلمہ صحافی کبھی یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے گی۔

سلمہ کو جب ان قوانین کا علم ہوا تو وہ بڑی گھبرائی۔ لیکن کچھ سوچ کر اُس
نے محکمہ تعلیم و حفظانِ صحت کو ایک خط لکھا اور ان قوانین کی طرف توجہ دلائی۔ نتیجہ یہ

ہوا کہ وزیر تعلیم نے ڈائنٹ کر وائس چانسلر کو ایک خط لکھا کہ ایسے قوانین بنا کر حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے پر آئندہ سخت سزا دی جائے گی۔ اس کے علاوہ محکمۂ حفظان صحت کے ایک انسپکٹر نے یونیورسٹی کا معائنہ کرتے ہوئے لڑکیوں کے بورڈنگ اور سُرنگ دونوں کو خلاف قانون قرار دے کر مسمار کرا دیا اگزکٹو کونسل کا ایک جلسہ فوراً صورت حال پر غور کرنے کے لئے منعقد کیا گیا۔ مولوی ابوالعلم نے فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی کا مسلک ہمیشہ حکومت کی اطاعت رہا ہے اِس لئے اُن کے لئے اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سلمہ صحافی کو بے پردہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیدیں۔ وائس چانسلر نے بھی کہا کہ بحالت مجبوری ان کو ایسا ہی کرنا ہوگا باقی آٹھ ممبران کونسل نے کہا۔ "جیسا آپ کا حکم سرکار" اور جلسہ برخاست ہو گیا۔

---

(۲)

مُسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں اتنا بڑا انقلاب کبھی نہ ہوا تھا جتنا ایک لڑکی سلمہ صحافی کے داخل ہونے پر ہوا۔ وہ شہر کی مزدور لڑکیوں کے ہوسٹل میں رہتی تھی جو بیسویں صدی کے ایک نواب مضمحل اللہ کے شاندار محل میں قائم کیا گیا تھا جب صبح کو وہ کالج جاتی تو ہر شخص کی نظر اُس کی طرف اُٹھتی۔ وہ حسین نہ تھی۔ لیکن نوجوان عورت علی گڈھ میں ہمیشہ سے ایک نایاب شے رہی ہے۔ یہ پہلی بار تھی کہ یونیورسٹی کے چند ہزار

طالب علموں نے ایک لڑکی کو طالب علم کی حیثیت سے دیکھا۔ سلمہ نے بیسویں صدی، علی گڑھ کے متعلق عجیب وغریب قصے سنے تھے کہ اس زمانہ میں اگر اسٹیشن پر سے کسی ریل میں کوئی حسین لڑکی گزرتی تھی تو تمام یونیورسٹی میں ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔

پہلے پہل سلمہ کو اس قدر عالمگیر توجہ کا مرکز بننا بُرا معلوم ہوا لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ اِس کی عادی ہو گئی۔ سب سے بڑا انقلاب اس کی کلاس یعنی ایل۔ایل۔بی پریویس میں ہوا تھا ایک سو اکیاون طالب علموں میں وہ اکیلی لڑکی تھی اِن سب کی توجہ کی وہ واحد مرکز تھی۔ جب سے اس نے داخلہ لیا تھا ان تمام لڑکوں میں بین تبدیلی نظر آتی تھی، جو تیسرے دن داڑھی مونڈتے تھے۔ وہ اب روز شیو کرنے لگے جو ہمیشہ میلے کپڑے پہن کر آتے تھے وہ اب صاف کپڑے پہن کر آنے لگے۔ جن کے کوٹوں پر برسوں سے برش نہ ہوا تھا اُن کے کوٹ اب چمکنے لگے۔ جن کے بالوں میں ہفتوں کبھی کنگھا نہ ہوتا تھا انھوں نے کلاس میں آتے وقت بھی جیب میں شیشہ کنگھا رکھنا شروع کر دیا۔ سب سے بڑا کمال یہ ہوا کہ تقریباً تمام طالب علم اب لکچر کے وقت حاضر رہنے لگے۔ ورنہ ایل۔ایل۔بی پریویس میں کبھی ۲۵ فی صدی سے زیادہ لڑکے حاضر نہ ہوتے تھے باقی سب دوستوں سے پراکسی بلوا کر کام چلاتے تھے۔ جس دن سے سلمہ صحافی نے داخلہ لیا لکچر روم بھرا رہنے لگا۔ فائنل کلاس کے طلبا بھی کسی نہ کسی بہانے سے آکر بیٹھنے لگے۔ پروفیسر کی زندگی میں بھی سلمہ صحافی کی موجودگی نے کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ بھی

اچھے کپڑے پہن کر آنے لگے جن کے کوٹ پر ہمیشہ چاک کی سفیدی پڑی رہتی تھی وہ کلاس میں آنے سے قبل نہایت احتیاط سے کوٹ پر برش کرنے لگے۔ سٹاف روم میں ایک آئینہ، کنگھا، کپڑوں اور بالوں کے برش رکھے گئے۔

کلاس کے تمام لڑکوں میں سلیم اور انور سلمہ میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دونوں یونیورسٹی کے بااثر اور مشہور طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ سلیم ٹینس کلب کا سکریٹری اور بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ سومنگ باتھ میں مچھلی کی طرح تیرتا تھا اور یو۔ ٹی۔ سی کا سارجنٹ تھا ساتھ ہی وہ ایک قابل رشک صحت اور سانچے میں ڈھلے جسم کا مالک تھا۔ اُس کو اپنے مردانہ حسن پر کافی ناز بھی تھا اور جب اُس نے سلمہ صحافی میں دلچسپی لینی شروع کی تو سوائے انور کے اُس کی رقابت مول لینے کی کسی نے ہمت نہ کی۔

انور اتنا حسین نہ تھا جتنا سلیم۔ وہ کھلاڑی بھی نہ تھا مگر پڑھنے لکھنے میں وہ سب سے تیز تھا اُس نے اول درجہ میں انگریزی ادب کا ایم۔ اے کیا تھا۔ یونین کا بہترین مقرر اور میگزین کا اڈیٹر تھا۔ اُس کے افسانے اور نظمیں ملک کے اکثر قدامت پسند رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ وہ سلمہ صحافی میں دلچسپی لیتا تھا اور کلاس میں جب ممکن ہوتا کوئی ادبی یا قانونی بحث چھیڑ کر اُس سے بات کرنے کا موقعہ نکال لیتا۔ انور اور سلیم قدامت پسند خاندانوں کے لڑکے تھے ان کے لئے عورت

ایک نامعلوم جنس تھی اس لئے وہ بیسویں صدی کے شاعر مزاج طالب علموں کی طرح ہر اُس لڑکی میں جس سے کسی طرح اُن کی ملاقات ہو جائے اس قدر دلچسپی لیتے تھے۔ اُن کے کلاس میں ایک لڑکا احسان اللہ پڑھتا تھا جس کی بدقسمتی سے سات بہنیں تھیں یہ سب لڑکیاں دہلی کی قومی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں لیکن چھٹیوں میں اکثر علی گڈھ اپنے بھائی سے ملنے آیا کرتی تھیں اس لئے کلاس کے تقریباً تمام لڑکے احسان اللہ سے دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر موقعہ پر اُس کی آؤ بھگت ہوتی اور نوجوان پروفیسر بھی اُس کا خیال رکھتے۔ سلیم اور انور نے خاص طور پر احسان میں دلچسپی لینی شروع کی۔ سلیم اُس کو روز ٹینس کھیلنے بلاتا اور کلب کی فیس اُس کے بجائے خود دیدیتا۔ انور اصرار کرتا کہ احسان اُس کے ساتھ مل کر امتحان کے لئے پڑھے۔ دونوں اُس کی دعوتیں بھی خوب کرتے۔ شروع شروع میں تو احسان ان سب عنایات کو دوستی پر محمول کرتا رہا۔ لیکن عرصہ کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ دونوں اِس سے زیادہ اُس کی بہنوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ جس دن اِس کی بہنیں دہلی سے آئیں سلیم و انور اُس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے اور اُس کی بہنوں کی خاطر و مدارات میں ضرورت سے زیادہ انہماک دکھاتے حالانکہ وہ سب مل کر ان دونوں کو بیوقوف بناتی تھیں۔ احسان ہمیشہ سے مُنہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ ایک دن جب اُس کو انور و سلیم کی حرکتوں سے سخت کوفت ہوئی تو اُس نے

اپنی بہنوں کے سامنے ہی ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ "دیکھئے صاحب! اس وقت آپ دونوں بھی موجود ہیں اور میری بہنیں بھی آپ کو ان میں سے جس جس سے دلچسپی ہو صاف کہہ دیجئے اُن کی مرضی ہو تو وہ آپ سے دوستی کریں۔ مگر مہربانی کرکے میری جان چھوڑیئے۔" اُس دن سے انور اور سلیم اور احسان اللہ کے تعلق کا خاتمہ ہو گیا اور اُن کو کسی نئے شکار کی تلاش ہوئی۔ جب سلمہ صحافی نے داخلہ لیا تو دونوں نے علیحدہ علیحدہ کوشش شروع کی کہ اس سے دوستی بڑھائی جائے ——

ایک صبح خالی گھنٹہ میں سلمہ برآمدے میں اکیلی کھڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر لڑکوں کا ایک گروہ کھڑا اُس کی طرف گھور رہا تھا۔ سلمہ کو اس قسم کی حرکتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور ہنسی بھی، غصہ اس لئے کہ خواہ نخواہ اِس کو کوئی کیوں اس طرح گھورے اور ہنسی اس بات پر کہ علی گڑھ کے یہ تعلیم یافتہ لڑکے اس قدر دقیانوسی تھے اکیسویں صدی میں بھی ایسی حماقتیں کرتے تھے۔ اُس کو اپنے ڈسک میں اکثر گمنام عاشقانہ خطوط ملتے تھے ایک بار تو ایک نامعلوم عاشق صاحب نے ایک قیمتی فاؤنٹین پن اِسی طرح تحفہ دیا تھا۔ روزانہ ڈسک کے اوپر گلاب کے پھول رکھے ملتے۔ لیکن ان سب مجنون صفت حضرات میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ کھلم کھلا اِس سے بات بھی کر سکے۔ سلمہ کھڑی اِن سب باتوں پر غور کر رہی تھی کہ سلیم صاحب اپنا بہترین سوٹ پہنے بالوں میں دھڑلے تیل لگائے اور فلم اسٹاروں جیسی مونچھیں بنائے ہوئے نازل ہوئے۔

"مس سلمہ صحافی" اُس نے جیسویں صدی کے انداز میں اس قدر جھک کر کہا کہ سلمہ کو ہنسی آ گئی۔ "آپ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟ .... ہاں .... وہ میرا مطلب یہ ہے آپ کوئی کھیل کیوں نہیں کھیلتیں؟ دیکھئے آپ کی رنگت زرد ہوتی جا رہی ہے۔ وہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ

All work and no play

Makes Jack a dull boy.

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وردھا میں ٹینس کی بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتی تھیں تو آپ ہمارے سومنگ باتھ کلب میں آج شام کو ٹینس کھیلنے آیئے نا؟" وہ سانس لینے کے لئے رُکا تو سلمہ نے کہا "شکریہ میں اب تک تو اس لئے کھیلنے نہ آئی تھی کہ شاید وائس چانسلر صاحب لڑکوں کے اخلاق خراب کرنے کے جرم میں مجھے یونیورسٹی سے نکال دیں۔"

سلیم اپنے آپ کو آزاد خیال اور ترقی پسند سمجھتا تھا۔ "ارے آپ بھی کیا کہتی ہیں کس کی مجال ہے کہ آپ کو یہاں سے نکال دے۔ ہم سب یونیورسٹی چھوڑ دینگے آپ شاید مجھ سے واقف نہیں ہیں؟ پچھلے سال ٹکڑوں میں میٹھا کم ہونے پر میں نے ایک مہینہ تک ڈائننگ ہال کا اسٹرائک کرا دیا تھا۔ آپ بے فکر ہو کر آج ہی سے کھیلنے آیئے۔"

سلمہ نے اپنی جان چھڑوانے کے لئے وعدہ کر لیا اور کہا کہ وہ اِسی مقام پر شام

کے پانچ بجے ملے گی اور پھر دونوں اکٹھے سومنگ باتھ لان ٹینس کھیلنے جائیں گے۔

سلیم اُس سے رخصت ہو کر خوش خوش اپنے کمرے کی طرف چلا راستہ میں سوچتا جا رہا تھا کہ "Doubles" میں سلمہ کو اپنے ساتھ کھلائے گا تاکہ پارٹنر، پارٹنر پکار کر پہلے ہی بے تکلفی بڑھا لے۔ ہوسٹل کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا کہ بغل میں کتابیں دبائے انور آتا ہوا ملا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ گھنٹہ تو خالی ہے" اس نے کہا

"اوہ میں تو ایسے ہی جا رہا ہوں" انور نے جواب دیا "ذرا لائبریری سے چند کتابیں لانی ہیں"

مگر ہوسٹل سے نکلتے ہی، بجائے لائبریری کے انور نے لکچر روم کا رُخ کیا۔ سلمہ اب تک برآمدہ میں کھڑی تھی۔ قدم بڑھاتے ہوئے اِس کے پاس پہنچ کر اِس عاشقِ جانباز نے بھی تنہائی میں گفتگو کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً تقریر شروع کر دی۔

"مس سلمہ صحافی۔ آداب عرض ہے۔ گستاخی معاف کیجئے گا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ کورس کی کتابوں کے علاوہ عام لٹریچر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ آپ کو لائبریری میں بھی کبھی آتے نہیں دیکھا۔ اس طرح لاپرواہی سے تو آپ کی واقفیتِ عامہ صفر ہو کر رہ جائے گی"

سلمہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا "تازہ کتابیں تو میرے پاس برابر

آتی رہتی ہیں مگر میرا خیال تھا کہ یونیورسٹی لائبریری میں شاید میرے کام کی کتابیں نہ ملیں
میں نے سُنا ہے کہ یہاں اشتراکی لٹریچر کی ممانعت ہے۔"

"اوہو آپ بھی کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں۔" انور نے جلدی سے کہا۔
"اب تو جب سے قومی حکومت قائم ہوئی ہے ہمارے پرووائس چانسلر صاحب نے حکم
دیا ہے کہ لائبریری میں انقلابی کتابوں پر سے ممانعت اُٹھالی جائے ..... ہاں
تو آپ میرے ساتھ لائبریری تشریف لے چلئے گھنٹہ بھی خالی ہے۔"

"معاف کیجئے گا۔ اِس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے لیکن اگر آپ شام
کو پانچ بجے مجھے اِسی جگہ ملیں تو ہم اکٹھے لائبریری چلے چلیں گے۔"

انور نے سوچا یہ بھی اچھا رہے گا۔ شام کو جب سب کھیل کے لئے چلے جاتے
ہیں لائبریری تقریباً سنسان معلوم ہوتی ہے سلمہ صحافی سے اکیلے میں خوب باتیں ہوسکینگی

---

(۳)

انور خوش خوش۔ "آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا" گاتا ہوا اپنے کمرے میں
داخل ہوا تو سلیم کو "پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں" گاتا ہوا پایا۔ اِن کے کمرے کا تیسرا
شریک آزاد حسبِ معمول پلنگ پر لیٹا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ جاسوسی ناول
پڑھنا اور سونا یہ آزاد کے محبوب مشغلے تھے۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو کسی شبہ حیات میں

بھی امتیاز نہیں حاصل کر سکتے۔ نہ وہ پڑھائی میں ہوشیار تھا اور نہ اُس نے میگزین میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ ملتا جلتا بھی وہ کم تھا اور اپنے کمرے کے رفیقوں سے بھی وہ بوقت ضرورت ہی بات کرتا تھا۔ وہ خوب صورت بھی نہ تھا چہرے پر موٹر سائیکل سے گرنے کے کئی نشانات تھے سانولا رنگ تھا۔ معمولی قد۔ خشک اور سخت بال جن میں شاید دن میں ایک بار بھی کنگھا نہ ہوتا تھا۔ غرض اس میں کوئی ایسی صفت نہ تھی کہ وہ طالب علموں یا صنف نازک میں مقبول ہو سکتا اور نہ وہ لڑکیوں میں غیر ضرورت دلچسپی کا اظہار ہی کرتا تھا۔ انور اور سلیم کے رومانی مشغلوں کو وہ غیر متعلق دلچسپی سے دیکھتا تھا نہ وہ اس کو اپنے رازوں میں شریک کرتے اور نہ وہ اس کی کوشش کرتا آج سلیم اور انور کی غیر معمولی بشاشت سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کو پھر رومانی کیڑے نے کاٹا ہے مگر اُس نے سوائے علیک سلیک کے کوئی بات نہ کی اور اپنا جاسوسی ناول پڑھتا رہا۔

"تم اتنے خوش کیوں نظر آتے ہو" انور نے سلیم کے گلے سے تنگ آ کر کہا۔

"تمھیں کیوں بتاؤں" سلیم نے بگڑ کر جواب دیا۔ "مگر میں کہتا ہوں کہ تمھیں آج کون سا خزانہ پڑا پا گیا ہے کہ خوشی سے پھٹے جا رہے ہو"

تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ انور اور سلیم دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس میں کپڑے تلاش کر رہے تھے۔

"ارے چھدو! ارے چھدو" انور نے نوکر کو پکارا۔ "وہ درزی میرا سوٹ لایا یا نہیں؟"

"اور وہ میرا بلیزر جس کی آستین کھولنے کے لئے دیا تھا۔ وہ آیا یا نہیں؟" انور نے سوال کیا۔

جب معلوم ہوا کہ درزی حسب معمول وعدے کے مطابق کپڑے نہیں لایا تو دونوں نے مل کر اُس کو بُرا بھلا کہا۔ اس کے بعد آزاد کا ٹرنک ٹٹولا گیا کہ شاید اس میں کچھ پہننے کے قابل کپڑے نکلیں مگر وہاں کیا ملتا۔ وہ تو جاڑے کا موسم ایک گرم پتلون اور گرمی سفید قمیص اور خاکی نیکر پہن کر گذار دیتا تھا۔

کھانا کھا کر سلیم نے سائیکل سنبھالی تو انور نے پوچھا "اس لُو گرمی میں کہاں چلے؟"

"تمھیں کیوں بتاؤں کہ درزی کے یہاں جا رہا ہوں" سلیم نے کہا اور سائیکل پر بیٹھ روانہ ہو گیا اُس کے چند منٹ بعد انور نے آزاد کی سائیکل سنبھالی۔

"میں نے کہا، شاعر صاحب" آزاد نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا "کسی کی تیر نظر سے میری سائیکل میں پنکچر نہ کر لائیے گا ——"

درزی کے یہاں سے کپڑے لے کر چلے تو انور کو خیال ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ نیا جوتا بھی ہونا چاہیے۔ اور سلیم کو یاد آیا کہ اُس کا ٹینس کا جوتہ ذرا پُرانا ہو چکا ہے۔ جوتوں والے کے برابر میں ایک جنرل مرچنٹ کی دوکان تھی۔ انور نے ایک نئی

ٹائی بھی خرید ڈالی۔ سلیم نے ایک ریشمی مفلر لیا۔ انور نے نئے بلیڈوں کا پیکٹ لیا تو سلیم کو یاد آیا کہ اُس کی Face Cream ختم ہوگئی ہے سلیم نے ریشمی رومال خریدا تو انور نے سینٹ کی شیشی۔

غرض تین بجے کے قریب دونوں دوست لدے پھندے واپس کمرے پہنچے۔ آزاد سو رہا تھا مگر دیر تک نہ سو سکا اُس کو ایسا معلوم ہوا کہ بھونچال آگیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو انور اور سلیم کمرے کے واحد آئینہ میں بیک وقت داڑھی مونڈنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں اور خوب گالم گلوچ اور چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ اِسی جھگڑے میں انور نے اپنا گال کاٹ لیا اور آزاد نے اُٹھ کر خون روکنے کے لئے پھٹکری لگادی تو اتنے زور سے چلایا کہ آس پاس کے کمرے والے سمجھے کوئی قتل ہوگیا ہے۔

غرض بڑی مشکل سے دونوں دوست تقریباً ساڑھے چار بجے سج دھج کر تیار ہوئے بالوں میں Anzora ڈالا گیا۔ مانگ پٹی کی گئی۔ چہرے پر کولڈ کریم کی مالش ہوئی مگر حالت قابل رحم تھی اتنی سخت گرمی کے باوجود انور نے کلپ دیا ہوا سخت کالر لگایا تھا جس نے اس کی گردن کو طوق کی طرح جکڑ دیا تھا اس پر غضب یہ کیا کہ نہ صرف کوٹ بلکہ واسکٹ بھی۔ سلیم نے بھی اپنی شان جمانے کے لئے یونیورسٹی کے رنگوں کا اونی بلیزر پہنا تھا غرض دونوں کا پسینہ کے مارے بُرا حال تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" انور نے سلیم سے پوچھا

"تم کوئی ٹھیکہ دار ہو،" سلیم نے کٹ کر جواب دیا "اور دیکھتے نہیں ہو کہ ٹینس کھیلنے جا رہا ہوں۔ تم بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو؟"

انور نے میز پر سے دو کتابیں اُٹھا کر بغل میں دباتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھتے نہیں ہو لائبریری جا رہا ہوں۔"

خدا خدا کر کے پونے پانچ بجے یہ دونوں روانہ ہوئے تو آزاد کو اطمینان نصیب ہوا۔ اِس نے تکیہ کے نیچے سے اپنا جاسوسی ناول نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا

---

(۴)

یونیورسٹی کلاک ٹاور نے چھ بجائے تو انور نے سلیم سے کہا۔ "بس بھائی اب چلو انتظار کی حد ہو گئی۔ اس لڑکی نے آج ہم دونوں کو بیوقوف بنا دیا۔"

دونوں دوست ایک گھنٹہ تک ٹہلتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ایک ہی مقام پر دیکھ کر تعجب ضرور ہوا تھا اور آپس میں فقرے بازی ہوئی لیکن کچھ عرصے کے بعد دونوں نے قبول دیا کہ اصل مقصد اِن کے آنے کا کیا تھا۔ جب چھ بج گئے اور سلمہ صحافی نہ آئی تو اُنھوں نے اُس کو بُرا بھلا کہنے کے بعد طے کیا کہ اب کہیں ٹہلنے چلا جائے۔

سومنگ باتھ رسٹوران میں شربت پینے کے بعد اُنھوں نے باتفاق رائے کھیتوں کا رُخ کیا، ریلوے لائن کو پار کر کے پگڈنڈی پگڈنڈی باتیں کرتے جا رہے تھے کہ کچھ فاصلہ پر دو سائیکلیں پڑی دیکھیں ان دونوں سائیکلوں کو وہ پہچانتے تھے فوراً جھجک گئے اور کھیت کی آڑ لے کر اِدھر اُدھر ہوشیاری سے نگاہ کی تو برابر کے کنوئیں کی ٹنڈیر پر آزاد اور سلمہ صحافی کو بیٹھا ہوا پایا۔ انور نے سلیم کی طرف دیکھا اور سلیم نے انور کی طرف۔ اِس ایک نگاہ میں تعجب، غصہ اور انتقام کی خواہش تمام جذبات موجود تھے غرض صورتِ حال پر مفصل تبصرہ تھا۔ آزاد اور سلمہ باتیں کر رہے تھے۔ کان لگا کر سُنا تو انور اور سلیم دونوں کے چہرے سُرخ ہو رہے تھے کیونکہ ذکر خیر اُن ہی کا تھا۔

"کاش تم اُن کو دیکھتے۔ انور نے مفلر باندھ کر اس پر گرم کوٹ پہنا اور سلیم نے نہ صرف سخت کالر لگایا بلکہ واسکٹ بھی پہنی پسینہ کا یہ حال تھا کہ خدا کی پناہ" اور دونوں نے اتنے زور سے ہنسنا شروع کیا کہ انور اور سلیم سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اُلٹے قدم واپس لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ خاموش چلتے رہے پھر دونوں بیک وقت بولے

"بدلہ لیں گے"

"بدنام کریں گے"

کچھ دُور واپس گئے تھے کہ اُن کا ایک کلاس فیلو فضل الدین مل گیا یہ بھی یونیورسٹی کے عاشق مزاجوں میں سے تھے مگر حال ہی میں شہر کے اسکول کی اپنے سے

عمر میں دس برس بڑی ایک دیسی عیسائی ہیڈ مسٹرس کے عشق میں زک اُٹھا چکے تھے اِس لئے فی الحال عورتوں کی قوم سے بغض رکھتے تھے۔ انور اور سلیم نے نہایت رازدارانہ طریقہ پر فضل الدین کو آزاد اور سلمہ کے پکڑے جانے کا "واقعہ" سنایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا۔ "بھائی کسی سے کہنا مت۔ کسی کو بدنام کرنے سے ہمیں کیا فائدہ؟"

ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ "واقعہ" یونیورسٹی کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔

---

(۵)

اور پھر وہ دن آیا جب مسلم یونیورسٹی میں ایک لڑکی بھی نہ رہی۔ زبانِ خلق سے تنگ آکر سلمہ اور آزاد دونوں نے نام کٹا لیا۔ سلمہ واردھا واپس چلی گئی اور آزاد اپنے جاسوسی ناولوں کا بنڈل اٹھا اپنے وطن چلا گیا۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ نے بوڑد گاؤں کے زمیندار کی سالگرہ کی خوشی میں ایک کالم سیاہ کرنے کے بعد چند لائنیں اس واقعہ پر بھی لکھیں اور لکھا "یہ خوشی کی بات ہے کہ مس سلمہ صحافی کے جانے کے بعد یونیورسٹی ایک خطرناک عنصر سے پاک ہو گئی۔"

حامد عباسی کی تجویز اور ناصر باعفی کی تائید پر یونین نے سلمہ صحافی کی جرأت کو سراہتے ہوئے ریزولیشن پاس کیا۔ ایک دوسرے ریزولیوشن سے یہ طے پایا کہ جو مخملی صوفے لڑکیوں کے لئے بنوائے گئے تھے اُن کو فروخت کر کے اس کے روپے سے

سلمہ صحافی کا ایک مجسمہ یونین ہال کے سامنے لان میں نصب کیا جائے تاکہ اس زمانے کی یادگار رہے جب یونیورسٹی میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔

حکومت کے قوانین کی رو سے طالب علموں کی انجمن خود مختار جماعت تھی اس لئے یونیورسٹی ایگزکٹو کونسل اس ریزولیوشن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکی اور بہت جلد مجسمہ نصب کر دیا گیا اسی سال یونیورسٹی کے بجٹ میں ایگزکٹو کونسل نے دس روپے کی رقم "طالب علموں کے اخلاق کی حفاظت کی تدابیر" کے لئے منظور کی۔ اس رقم سے ایک برقعہ سلوایا گیا اور سلمہ صحافی کے مجسمہ کو اڑھا دیا گیا۔

اور مدت تک یہ برقعہ سلمہ صحافی کے مجسمہ پر ڈھکا رہا اور ہوا میں پھڑپھڑا کر قریب سے گذرنے والوں کو عبرت دلاتا رہا مگر ۲۰۴۷ء میں جس سال ہندوستان میں پہلی بار اشتراکی حکومت قائم ہوئی ایک خوفناک زلزلہ آیا جس میں بنارس اور علی گڈھ یونیورسٹی کی تمام عمارتیں تباہ ہو گئیں مگر سلمہ صحافی کا مجسمہ اسی طرح قائم رہا۔ زلزلہ کے ساتھ ہی ایک زبردست آندھی چلی جو اس تاریخی برقعے کو اڑا کر لے گئی۔

سرکشی

دسمبر کا مہینہ بمبئی میں عجیب چہل پہل کا ہوتا ہے سمندر کی قربت کی وجہ سے شمالی ہند جیسی سردی تو نہیں پڑتی مگر موسم کافی خوشگوار ہو جاتا ہے سیاحوں کی کثرت ہوتی ہے، تجارت فروغ پر ہوتی ہے تفریح گاہوں پر ہجوم ہوتا ہے غرض شہر کی نبض تیز ہو جاتی ہے اور ہر شخص اپنے جسم میں نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

گل بانو..... نوجوان، لمبے سیاہ بالوں والی گل بانو..... بھی اپنے جسم میں ایک نئی زندگی اور اپنی روح میں ایک نئی تڑپ محسوس کر رہی تھی۔ اٹھارہ سالہ گل بانو زندگی کے اس دور سے گزر رہی تھی جب دل میں امنگیں اور دماغ میں منصوبے ہوتے ہیں۔ خود زندگی ہی ایک بہت دلچسپ، بہت رنگین کھیل ہوتی ہے جب آنکھوں میں چمک ہوتی ہے اور چال میں والہانہ پن۔ جب حوصلوں سے سر اونچا ہوتا ہے

اور دنیا کی ہر طاقت اپنے سامنے ہیچ معلوم ہوتی ہے جب دل میں دنیا بدل دینے کی ہمت ہوتی ہے اور حصول مقصد میں جان فروشی کی آرزو۔ گل بانو دو سال سے میڈیکل کالج میں تعلیم پاتی تھی۔ یہ اس کا تیسرا سال تھا اور دو سال میں وہ باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر ہو جائے گی یہ خیال اُس کے لئے کس قدر خوشگوار تھا پھر وہ گھر کی قید سے آزاد ایک خود مختار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرے گی۔ اس نے اپنی زندگی کے لئے ایک باقاعدہ پروگرام بنا رکھا تھا اس کا ارادہ تھا کہ اپنا مطب مزدوروں کے محلے میں کھولے گی تاکہ ان بدنصیب عورتوں اور بچوں کا علاج کر سکے جو سرمایہ داری کی بدولت تنگ اور اندھیرے مکانوں میں رہتے اور جن کی آمدنی اتنی محدود ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اور دوا کا خرچ تو کجا پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسر نہیں آتا۔ اس کو روپیہ پیدا کرنے کا شوق نہ تھا اس کے باپ نے جو پچیس برس تک ایک سیٹھ کے کپڑے کے کارخانے کا منیجر رہا تھا کافی روپیہ پیدا کیا تھا مگر گل بانو کو بچپن ہی سے اس اقتصادی نظام سے سخت نفرت تھی جس کی خدمت سے اِس کے باپ نے دولت کمائی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو مزدوروں پر ظلم کرتے ہوئے دیکھا تھا اس نے گڑگڑاتی ہوئی عورتیں اور سسکتے ہوئے بچے دیکھے تھے اس نے کارخانے کے مالک سیٹھ سلمانی کا مالابار ہل پر عالی شان محل دیکھا تھا اور کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی اندھیری اور بدبودار۔ چالیں، بھی جہاں چھوٹے چھوٹے کمروں میں دو دو خاندان زندگی بسر کرتے تھے وہ اس نظام کو بدلنا چاہتی

تھی جو ایسا ظلم روا رکھتا ہے اور اِس کا ارادہ تھا کہ ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی کام بھی کرے گی۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ ہر گھر میں جا سکے گی اور اس طرح وہ اِن مزدوروں اور ان کی عورتوں کے بجھے ہوئے دلوں اور دماغوں کو روشن کرے گی۔ اُن کو اُنکے حقوق سے آگاہ کریگی اور اِس جنگ کے لیے تیار کریگی جو ایک دن نیا اور بہتر نظام قائم کرنے کے لئے کی جانے والی ہے۔ اِس کے یہ خیالات اگر ایک طرف اِس کے مشاہدہ کا نتیجہ تھے جو اس کو اپنے باپ کے کارخانے اور میڈیکل کالج کے ہسپتال میں حاصل ہوا تھا تو دوسری طرف وہ اشتراکی تحریک کی ہنگامہ خیز کارروائیوں اور پرجوش انقلابی لٹریچر سے بھی متاثر ہوئی تھی اُس نے مزدوروں کو سُرخ جھنڈے لئے ہوئے جلوسوں میں دیکھا تھا، اشتراکی لیڈروں کی تقریریں سُنی تھیں۔ اشتراکیت پر چند ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں اِس لئے دیکھا تھا کہ اس عمر کے لوگوں کا رجحان کدھر ہے۔ نئے خیالات کی اس رو میں ہر ایک دل تڑپ رکھنے والا تھا۔ زمانہ کا تقاضہ اور اِس کے اپنے دماغ کا یہی فیصلہ تھا کہ وہ اِسی تحریک کا ساتھ دے۔ مانا کہ اکثر کھاتے پیتے سفید پوش اشتراکیوں کی طرح عوام کی بہبودی میں اس کی دلچسپی کسی قدر ہمدردانہ اور مشفقانہ تھی اور اس ہمدردی کا اظہار بھی فی الحال الفاظ ہی تک محدود تھا مگر باوجود ان ناگزیر کمزوریوں کے جو اس کو پچھلی نسلوں سے ورثہ میں ملی تھیں اس میں سماجی حقائق سمجھنے کی صلاحیت تھی اور خدمت خلق کا جذبہ ——

کالج میں، گھر پر، راستہ میں وہ یہی منصوبہ بنایا کرتی۔ مگر اپنی اسی خیالی دنیا میں وہ اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اِس کے ساتھ ایک رفیق اور دوست کی حیثیت سے اس کا شوہر بھی ہوتا تھا۔ وہ ایک خوش مزاج اور خوددار جوان تھا۔ جو اس کی خانگی، فنی اور سیاسی زندگی میں برابر کا شریک تھا لیکن وہ کون تھا۔ اس کا نام کیا تھا؟ یہ گل بانو کو بھی معلوم نہ تھا باقی تمام منصوبوں کی طرح یہ خیالی شوہر بھی فقط اِس کے دل و دماغ میں مکین تھا۔ ظاہری دنیا میں اس کی ابھی کوئی اصلیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر گل بانو خیالی شریک زندگی کے متعلق اتنا سوچتی کہ یہ محسوس ہونے لگتا کہ گویا وہ واقعی کوئی اصلیت رکھتا ہے۔

ایک دن وہ ایسے ہی خوشگوار خیالات میں مست کالج کے دروازے سے نکل کر ٹرام کی طرف جا رہی تھی کہ موتی لال نے آواز دی۔

موتی لال گل بانو کا ہم جماعت تھا۔ وہ ایک مخنتی اور خاموشی پسند طالب علم تھا۔ اور لڑکوں کی طرح وہ لڑکیوں کے پیچھے مارا مارا نہ پھرتا۔ کلاس کی لڑکیوں میں اُس کی ملاقات فقط گل بانو سے تھی۔ وہ بھی اس لئے کہ عمل جراحی کے کمرے میں ان کو ایک ہی میز پر کام کرنا پڑتا تھا۔ گو ہفتہ میں کئی بار ان دونوں کا اس طرح ساتھ ہوتا تھا مگر سوائے رسمی سلام کلام یا کام سے متعلق گفتگو کے کبھی اور بات نہ کرتا دراصل وہ فطرتاً بہت کم گو اور حساس واقع ہوا تھا۔ اس کو ہمیشہ یہ خطرہ رہتا تھا کہ اگر اِس نے گل بانو سے بات

کرنے میں ابتدا کی اور اس نے جھڑک دیا تو سخت خفت ہوگی۔ مگر آج کے زندگی بخش موسم نے اس کے دل میں بھی جرارت پیدا کر دی تھی اس نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ گل بانو کو اپنے ساتھ سینما دیکھنے کی دعوت ضرور دے گا۔ خواہ وہ انکار ہی کیوں نہ کر دے۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں" اس نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

گل بانو کو موتی لال سے کافی دلچسپی تھی وہ مدت سے جانتی تھی کہ وہ اس سے ملاقات بڑھانا چاہتا ہے مگر جھینپتا ہے۔ دراصل وہ اس انتظار ہی میں تھی کہ موتی لال اس کی طرف اپنی توجہ کا اظہار کرے۔ دوسری لڑکیوں کی طرح گل بانو کے دل میں بھی خواہش تھی کہ کوئی معقول نوجوان اس سے دلچسپی لے، اس کو اپنا ہمراز بنائے اور اس کا ہمراز بنے۔ کلاس کے کتنے لڑکے گل بانو کی نظر التفات کے امیدوار رہتے تھے لیکن وہ سب چھچھورے اور بدتمیز قسم کے تھے اور گل بانو جیسی طبیعت کی لڑکی کے لئے ان میں دلچسپی لینا ناممکن تھا۔ موتی لال ان سب سے مختلف تھا اس کا شرمیلا پن، صنف نازک کی موجودگی میں گھبراہٹ یہ اس کی وہ خصوصیات تھیں جو گل بانو کے لئے ایک عجیب کشش رکھتی تھیں۔ آج جب موتی لال نے خود گفتگو میں پیش قدمی کی تو اس کی مراد بر آئی۔

"گھر جا رہی ہوں۔ اور کہاں جا سکتی ہوں" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ایسی جلدی کیا ہے؟ قریب ہی سینما میں پال مونی کا فلم "لوئی پاسٹیور" ہو رہا ہے۔ اگر ہرج نہ ہو تو چلئے دیکھ لیں"

گل بانو نے جواب دینے سے پہلے کچھ توقف کیا۔ اس کو میڈیکل کالج میں داخل ہوئے دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا مگر اب تک وہ اکیلی کسی لڑکے کے ساتھ سینما نہ گئی تھی۔ وجہ یہ تھی، گو اس کا گھرانہ پردہ کی بندشوں سے آزاد تھا مگر اس کے والدین سوائے کالج کے کہیں اور گل بانو کو تنہا جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اگر آج وہ موتی لال کے ساتھ سینما چلی گئی تو یقین تھا کہ گھر پر بُری طرح ڈانٹ پڑے گی۔ اس خوف کے ساتھ ساتھ اس کا دل سینما جانے کو بُری طرح چاہ رہا تھا۔ تین مہینے سے اس نے کوئی فلم نہ دیکھا تھا کیونکہ اس کا بڑا بھائی جس کے ساتھ کبھی کبھی وہ سینما جایا کرتی تھی، احمد آباد گیا ہوا تھا۔ پال موتی اس کا محبوب فلم اسٹار تھا اور اس کے فلم "لوئی پاستیور" کی تعریف اس نے ہر ایک سے سُنی تھی۔ یہ فلم اٹھارھویں صدی کے مشہور فرانسیسی ڈاکٹر "لوئی پاستیور" کے حالات زندگی پر مبنی تھی جس نے باوجود قدامت پسند طبیعتوں کی سخت مخالفت کے انجکشن کے ذریعہ ایک نئے طریقہ علاج کی بنیاد ڈالی تھی گل بانو نے "لوئی پاستیور" کا نام اپنی درسی کتابوں میں پڑھا تھا اور اس کے لازوال طبّی کارناموں کی وہ زبردست معترف تھی۔

میڈیکل کالج کا تقریباً ہر طالب علم اس فلم کو دیکھ چکا تھا۔ شاید فقط ایک گل بانو ہی رہ گئی تھی۔

"مگر آپ تو یہ فلم دیکھ چکے ہیں نا؟" اُس نے موتی لال سے سوال کیا۔

"جی ہاں، مگر آپ نے تو نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ میں خود اس فلم کو دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

گل بانو کے دل میں والدین کے خوف اور فلم دیکھنے کے شوق میں کشاکش ہو رہی تھی۔ مگر والدین کی ڈانٹ تو بعد میں پڑے گی فی الحال تو اس خوشگوار موسم کے کئی گھنٹے ایک دلچسپ رفیق کی صحبت میں گذارنے اور بلند پایہ فلم دیکھنے کی خواہش تھی دسمبر کی اس سہ پہر میں باغیانہ خیالات کو بھڑکانے کی ایک عجیب طاقت تھی۔ ماں باپ کے خوف پر موتی لال کا اصرار غالب آگیا۔

گل بانو نے کہا "بہت اچھا چلئے۔"

(۲)

وہ شام گل بانو کی زندگی کی دلچسپ ترین شام تھی۔ باوجود اپنی فطری کم گوئی کے موتی لال ابتدائی جھجک نکل جانے کے بعد نہایت بامذاق اور دلچسپ باتیں کرنے والا ثابت ہوا سینما کے شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ دونوں نے ایک رسٹوراں میں چائے پی۔ گفتگو کا سلسلہ سینما شروع ہونے تک جاری رہا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس پر ان دونوں نے تبادلہ خیالات نہ کیا ہو۔ سیاست، سماجی رسوم، معاشیات موجودہ طبقی رجحانات۔ ادبی مسائل۔ موتی لال کی عام واقفیت حیرت انگیز تھی اور گل بانو بھی دنیا کے مسائل کے متعلق اتنا ضرور جانتی تھی کہ ان پر گفتگو کر سکے اکثر باتوں پر ان کو اتفاق تھا۔ موتی لال بھی ڈاکٹری تعلیم کو روپیہ پیدا کرنے کا ذریعہ

نہ سمجھتا تھا۔ مگر اس کے خیالات میں زیادہ پختگی تھی۔ اُس نے دنیا کا نشیب و فراز دیکھا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے اِس کو شروع ہی سے اپنے اوپر بھروسہ کرنا پڑا تھا۔ ایک رشتہ کے چچا اور وظائف کی مدد سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ افلاس کی تکلیف و حقیقت سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ گل بانو کی طرح اِس کی اشتراکیت غریبوں سے "ہمدردی" پر نہیں بلکہ خود اپنی مفلسی کے تجربات پر مبنی تھی۔ جب اس نے اپنے اور گل بانو کے لیئے نو نو آنے کے ٹکٹ خریدے تو گل بانو (جو ہمیشہ اُونچے درجے میں جانے کی عادی تھی) یہ سمجھی کہ یہ بھی کوئی اشتراکی اصول ہے کہ فضول خرچی نہ کی جائے۔ کہنے لگی "یہ بہت ٹھیک ہے بھلا بے کار پیسہ خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟ ہزاروں غریب بیچارے تو چار آنے والا ٹکٹ بھی نہیں خرید سکتے۔" موتی لال مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ گل بانو کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ساتھی کی جیب میں یہ ٹکٹ خریدنے کے بعد فقط چار آنے باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سے دو آنے ٹرام کے کرایے میں خرچ ہو گئے۔ جب وہ سینما ختم ہونے پر گل بانو کو اِس کے مکان چھوڑنے گیا۔

نو بج رہے تھے جب گل بانو مکان میں داخل ہوئی۔ شام بھر وہ اس قدر خوش رہی تھی کہ اِس کو اب تک یہ خیال نہ آیا تھا کہ اِس کی اتنی رات گئے واپسی پر گھر میں ایک طوفان بپا ہو گا۔ ماں باپ دونوں گول کمرے میں بپھرے ہوئے بیٹھے تھے، جانے

ہی ماں نے للکارا۔

"اری او گلو ادھر آ۔" اور پھر طنزیہ لہجہ میں "اب تک کہاں تھیں میم صاحب؟"

گل بانو نے کبھی اپنے والدین سے جھوٹ نہ بولا تھا۔ "معاف کیجئے گا اماں

آپ کو اور ابا کو کھانے پر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں ایک دوست کے ساتھ سینما دیکھنے

چلی گئی تھی"

"کس دوست کے ساتھ؟" اس کے باپ نے بگڑ کر سوال کیا۔

"موتی لال کے ساتھ میرا ہم جماعت ہے"

اس جواب سے تو گویا گل بانو کے ماں باپ کے مزاج کا پارہ آسمان پر

پہنچ گیا۔ باپ کو جتنی گالیاں اور ماں کو جتنے کوسنے یاد تھے وہ موتی کی تعریف میں

صرف ہو گئے ــــــ

ماں نے آنسو بہا کر کہا "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ لڑکی کو کالج میں مت داخل

کرو۔ آخر کو وہی ہوا نا جس کا کھٹکا تھا ...."

"آخر کیا ہوا؟" گل بانو جواب تک دم سادھے کھڑی تھی تنگ آ کر بولی

"مجھے بھی تو اپنا جرم معلوم ہو"

"جرم پوچھتی ہے" باپ نے گرج کر کہا۔ "ایک کافر بچے کے ساتھ پھرو تم اور

ہم سے پوچھو کہ جرم کیا ہے؟ آوارہ کہیں کی"

گل بانو کو بچپن سے والدین کی اطاعت کا سبق پڑھایا گیا تھا اس کو اپنے ماں باپ سے محبت بھی بہت تھی اور اُن کا ادب بھی کرتی تھی مگر اس کا جذبہ خودداری فنا نہ ہوا تھا۔ اپنی عصمت کی یہ تحقیر سُن کر اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ادب اور لحاظ، محبت اور اطاعت کے تمام جذبات ایک لمحہ کے لئے مفقود ہو گئے۔ اس وقت وہ کسی کی اولاد نہیں تھی۔ وہ ایک عورت تھی جس کے پاک دامن پر ایک ناروا دھبہ لگایا گیا تھا۔ غصہ سے اُس کی آواز کانپ گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے مگر نسوانی وقار نے اس کی گردن نہ جھکنے دی۔ سر اونچا کر کے بولی: "گستاخی معاف کیجئے ابا۔ میں یہ الفاظ نہیں سُن سکتی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ چاہیں تو آپ میری گردن اُڑا دیں مگر میری آبرو پر بٹہ لگانے کا اختیار آپ کو بھی نہیں ہے۔"

اِس کے باپ کو کبھی یہ گمان نہ تھا کہ بیٹی ایسا جواب دے گی۔ ایسی گستاخی، یہ جرارت۔ اس کی تو فوراً سزا دینی چاہیئے۔ ماں بھی چلا کر بولی۔

"سُن لو صاحبزادی صاحبہ کی باتیں۔ آج ٹرٹر جواب دے رہی ہے۔ کل ہم پر ہاتھ اُٹھائے گی۔" اب تو اِس کے باپ کی آتش غضب اور بھی بھڑک اُٹھی۔ چلا کر کہا۔ "بھلی خیر ہے تو نکل جا یہاں سے۔ اسی دم۔ میرے گھر میں آوارہ لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

یہ سُن کر گل بانو سناٹے میں آ گئی۔ اب تک اِس کو خیال تھا کہ زبانی ڈانٹ

ڈپٹ پر بات ٹل جائے گی مگر جب گھر چھوڑنے کا حکم سُنا تو وہ کئی سیکنڈ اسی سوچ میں کھڑی رہی کہ کیا کرے ان حالات میں گھر میں رہنا ناممکن نظر آتا تھا۔ مگر گھر چھوڑے تو جائے کہاں؟ اسی کش مکش میں تھی کہ باپ کے الفاظ پھر کان میں گونجے "میرے گھر میں آوارہ لڑکی کی کوئی جگہ نہیں ہے" اس نے بغیر ایک لفظ کہے ساڑی کا پلّو سر پر ڈالا اور خاموشی سے دروازے کے باہر نکل گئی۔ چند منٹ تک کمرہ میں سناٹا چھایا رہا۔ گل بانو باہر دہلیز کے برابر کئی منٹ تک کھڑی رہی اس اُمید میں کہ دوبارہ سوچنے پر اُس کے والدین پھر اندر بلا لیں گے مگر وہ دونوں اسی خیال میں تھے کہ گل بانو اُن سے معافی مانگ لے گی اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرے گی۔ مگر وہ بھی ان کی اولاد تھی۔ دونوں طرف ضد برقرار رہی۔

گل بانو کے گھر کا قاعدہ تھا کہ دس بجے رات کو صدر دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ جب گھنٹہ بجنا شروع ہوا تو گل بانو کی ماں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا "بند کردو" وہاں سے حکم ملا۔ گل بانو نے حسرت بھری نگاہوں سے مُڑ کر دیکھا۔ چٹخنی چڑھانے کی آواز آئی۔ اور والدین کے گھر کا دروازہ اُس کے لئے ہمیشہ کے واسطے بند ہو گیا۔

(۳)

پانچ مہینے گذر گئے اس عرصہ میں گل بانو کی زندگی میں ایک انقلاب ہو چکا تھا۔ وہ اب ایک دولت مند گھرانے کی خوش پوش اور بے فکر لڑکی نہیں بلکہ ——

ہسپتال میں ایک نرس تھی گھر سے نکالے جانے پر اس نے کالج سے نام کٹا یا تھا کیونکہ بغیر والدین کی مدد کے وہ فیس اور کتابوں کے اخراجات برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میڈیکل کالج میں تین سال تعلیم پانے کی وجہ سے اس کو نرس کا کام ملنے میں آسانی ہوئی۔ اِس کو چالیس روپے ماہوار ملتے تھے جس میں سے پچیس کھانے اور کمرے کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح گذارہ کرتی تھی۔ اب اِس کو عمر میں پہلی مرتبہ مفلسی کا تجربہ ہوا تھا۔ ہسپتال کا کام سخت اور تنخواہ کم۔ پانچ ہی مہینے میں گل بانو کو معلوم ہو گیا کہ سماج سے بغاوت آسان کام نہیں ہے مگر اس کی فطری ضد اور خودداری اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ مالی امداد کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ ہر ہفتے خیریت کا ایک پوسٹ کارڈ ماں کے نام بھیج دیتی تھی مگر کبھی خرچ کے لئے روپیہ نہ طلب کیا۔ ایک دفعہ محبت سے مجبور ہو کر ماں نے کچھ روپیہ بھیجا بھی تو گل بانو نے واپس کر دیا۔ دراصل اس کے دل میں اب بھی اپنے ماں باپ کے لئے اتنی ہی محبت تھی، کوئی غصہ یا نفرت کا جذبہ اُن کے خلاف نہ تھا۔ کہ وہ دونوں اپنے ماحول اور تربیت اور سماجی نظریہ سے مجبور رہیں جو کچھ ظلم انھوں نے اس پر کیا، اس میں ان کا نہیں بلکہ اس سماجی نظام کا قصور تھا جو ایسے حالات روا رکھتا ہے اِس لئے اس کے دل میں اگر بے پناہ غصہ تھا تو سماج کے خلاف اور اس کے ان قوانین کے خلاف جو ایک عورت کے ساتھ لونڈی غلاموں کا سلوک

کرتے ہیں۔

اِس عرصہ میں موتی لال کے ساتھ اُس کے تعلقات عجیب طرح کے تھے جیسے ہی موتی کو معلوم ہوا کہ گل بانو اِس کی وجہ سے گھر سے نکال دی گئی ہے وہ دوڑتا ہوا اُس کے پاس آیا تھا۔ اِس کو واقعی افسوس تھا کہ اِس کی خاطر اس غریب لڑکی پر اِتنا سنگین الزام لگایا گیا۔ لیکن اب کیا چارہ تھا۔ اُس کو گل بانو سے محبت تھی اور اِس مصیبت میں ہمدردی بھی۔ یہ بھی اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ گل بانو بھی اِس میں کافی دلچسپی رکھتی ہے اِس نے یہ بھی جلد دیکھ لیا کہ میڈیکل کالج کے شوقین مزاج لڑکے اور ہسپتال کے نوجوان ڈاکٹر گل بانو کی بے چارگی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں وہ ان میں سے کسی کو مُنہ نہ لگاتی تھی۔ مگر موتی لال اِس صورت حال کو گوارا نہ کر سکتا تھا اِس کے لئے ایک ہی طرزِ عمل ممکن تھا۔ اس نے شادی کی تجویز پیش کر دی۔

مگر گل بانو پر اس تجویز کا الٹا اثر ہوا۔ وہ موتی لال کو بے حد پسند کرتی تھی شاید چاہتی بھی تھی۔ لیکن اِس کو یقین نہ تھا کہ آیا اس نے شادی کی تجویز محبت کی خاطر کی ہے یا فقط ہمدردی کے لئے۔ اِس کو یہ شبہ ستاتا تھا کہ شاید اِس کی موجودہ مصیبت سے متاثر ہو کر موتی ازدواجی تعلقات پیدا کر کے اس کی خبر گیری کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے یہ اس کو منظور نہ تھا۔

غرض اُس نے شادی سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس وقت تک وہ موتی کی تجویز منظور نہیں کریگی جب تک اس کو یہ یقین نہ ہو جائے گا کہ اس تجویز کی محرک ہمدردی اور فیاضی نہیں بلکہ محبت ہے۔ موتی نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن گل بانو اپنے فیصلہ پر قائم رہی۔ دونوں کی دوستی پھر بھی برقرار رہی۔ ہر روز شام کو دونوں ساتھ ٹہلنے جاتے تھے لوگ چہ میگوئیاں ضرور کرتے۔ مگر ان کو کسی کے کہنے سننے کی کب پرواہ تھی۔

(۴)

ایک روز شام کو جب موتی حسب معمول چار بجے کے قریب گل بانو کے گھر پہنچا تو میز پر ایک پرچہ پڑا پایا۔

"موتی۔ میرے بھائی صاحب کا خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ والدہ سخت بیمار ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتی ہیں اس لئے میں گھر جا رہی ہوں اگر اُن کی طبیعت سنبھل گئی تو شام کو واپس آجاؤں گی۔ چھ بجے تک انتظار کرنا۔ گل"

چھ بجنے میں چند منٹ تھے جب گل بانو واپس آئی کمرے میں خاصہ اندھیرا تھا چہرہ نظر نہیں آتا تھا مگر موتی لال نے اس کے انداز میں ایک عجیب افسردگی پائی۔ کمرے میں خاموشی سے داخل ہو کر گل بانو نے بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کی۔ اب موتی نے دیکھا کہ رونے سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔ بلا کچھ کہے سُنے وہ کرسی

پر بیٹھ گئی باوجود ضبط کے ایک آنسو آنکھ سے ٹپک پڑا۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے؟ تمہاری والدہ کا مزاج کیسا ہے؟" موتی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اچھی ہیں"

"تو پھر؟ تم کیوں رو رہی ہو گل بانو: کیا مجھے بھی نہ بتاؤ گی؟"

گل بانو نے کوئی جواب نہ دیا فقط ہاتھ کی ایک جنبش سے ساڑھی کا آنچل سر سے گرا دیا۔ موتی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ ریشمی سیاہ لمبے بال اب اس کے سر کی زینت نہ تھے ان کے بجائے کٹے ہوئے بالوں کے بے ترتیب اور خون آلود گچھے ایک وحشت ناک منظر پیش کر رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ کسی بے درد نے کند قینچی سے یہ ظلم کیا ہے۔

"کس نے؟" موتی کی زبان سے یہ سوال بھی مشکل سے نکلا۔

"بھائی نے" آنکھیں جھکا کر گل بانو نے جواب دیا۔ "تم سے دوستی کرنے کا انعام ہے"

"تو اب اس کا بدلہ بھی میں لوں گا" موتی غصہ سے کانپ رہا تھا۔ "اس جلاد کو، اس ظالم کو سزا بھگتنی پڑے گی۔ مار ہی ڈالوں گا"

"میرے بھائی کو؟"

لاجواب ہو کر موتی لال بیٹھ گیا۔ گل بانو کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان پایا گویا بدترین غم و تکلیف سے گزر کر وہ ابدی سکون کا راز پا گئی ہو۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مسکرا دی۔

اب گل بانو نے پورا واقعہ سُنایا کہ کس طرح اِس کے بھائی کو احمد آباد سے واپسی پر تمام واقعات معلوم ہوئے اور یہ سُن کر کہ اِس کی بہن نے ایک ہندو کی خاطر گھر چھوڑ دیا تھا وہ غصّہ سے دیوانہ ہو گیا۔ اسی جنون میں اس نے بہن کو دھوکے سے گھر بُلا کر اس کے بال کاٹ ڈالے۔ یہ قصّہ سناتے وقت اِس کی آواز میں غصّہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ محبت کرنے والی بہن نے بھائی کی اِس سفاکی کو بھی معاف کر دیا تھا۔

کچھ دیر کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ پھر گل بانو بولی۔ "موتی تمھیں یاد ہے کہ تم نے اکثر مجھ سے شادی کرنے کو کہا ہے۔ کہو اب بھی تیار ہو؟"

"گل مجھ سے پوچھتی ہو، گویا اس واقعہ سے میرے جذبات بدل سکتے ہیں۔ میرے دل میں اِس وقت تمہاری محبت اور عزت پہلے سے بھی ہزار گنی ہے"

"اچھا تو ابھی رجسٹرار کے یہاں چلو ہم سول میرج قانون کے مطابق شادی کریں گے۔

"گل!" اِس خوشی کے لمحہ میں موتی کی زبان سے فقط ایک ہی لفظ نکل سکا۔

دونوں باہر جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ شام کے چھ بجے بعد کوئی سرکاری دفتر نہیں کھلا ہوتا۔

کمرے سے باہر نکلنے لگے تو موتی گل بانو کے سر کی طرف دیکھ کر جھجکا۔ سر بدستور کھلا تھا ——

"گل" اُس نے کہا اور سر کی طرف اشارہ کیا کہ آنچل ڈال لے ——

اُوہ۔ یہ؟ گل بانو نے ہنس کر کہا "اِس کو کیسے چھپا سکتی ہوں یہ تو میری آزادی کا اعلان ہے"

اس وقت اُس کی آنکھوں میں وہ سرکشی تھی جس نے بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت اُلٹ دیئے ہیں اور سنگین ترین رواجوں کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔

ناگن

مہینے میں ایک آدھ مبارک دن ایسا ہوتا ہے۔ جب بلا ارادہ صبح سویرے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اور جب کبھی بھی ایسا سانحہ درپیش آتا ہے تو بندہ پیر کو ضرور جاتا ہے۔ ٹانگوں کو زیادہ تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ رانی کا باغ مکان کے برابر ہی ہے۔ سیدھا وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ باغ پر بہار ہوتی ہے۔ مالی پھولوں کو پانی دیتے ہوتے ہیں۔ تالاب میں مرغابیاں کنول کے پھولوں کے درمیان تیرتی ہوتی ہیں۔ کوئل کی کوک کیساتھ شیر کے دہاڑنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ بندروں کے پنجرے کے سامنے بعض لوگ کھڑے ہوتے اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہوتے ہیں۔ رانی کے باغ میں بھانت بھانت کے جانور اور انسان ملتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں لیکن وہاں میں نے آجتک کسی کو اقبال مرحوم کے اشعار گاتے ہوتے کبھی نہ سنا تھا۔

اس صبح کو جب میرے کان میں آواز آئی :-

میں جو روئے قبلہ ہُوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

تو مجھ کو پہلے تو تعجب ہوا اور پھر غصہ آیا کہ یہ شخص آخر کیوں شعر کو غلط پڑھ کر مرحوم شاعر کی رُوح کو تکلیف دے رہا ہے۔ آواز کی سمت گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ باغ کے ایک کونے میں ایک شخص تنہا بنچ پر بیٹھا مزے لے لیکر یہی مصرع دُہرا رہا ہے،

مَیں جو روئے قبلہ ہُوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

گانے والے کی وضع قطع کافی دلچسپ تھی حسین تو نہیں مگر بدصورت بھی نہ تھا عمر کوئی تیس برس کی ہوگی۔ ڈاڑھی مونچھ مُنڈی ہوئی، دُہرا بدن، صحت بہت اچھی اور چہرے پر خون کی سُرخی جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ابھی بمبئی میں ایرانی ہوٹلوں کا کھانا کھانے کا زیادہ اتفاق نہیں ہُوا۔ میں نے ایک افسانہ نگار کی متجسس نگاہ اس پر ڈالی اور دماغ میں اس کا پُورا حُلیہ محفوظ کر لیا۔ شکل وصورت کے مُطالعہ کے بعد اُس کے لباس پر نظر کی تو دیکھا کہ ایک قیمتی کپڑے کے سُوٹ میں ملبُوس ہے مگر کوٹ اور پتلون کی ساخت صاف بتا رہی تھی کہ گاؤں نہیں تو کسی قصبے کے درزی کے ہاتھ کی سلائی ہے۔ باوجود سخت گرمی ہونے کے وسکٹ بھی زیب تن تھی جس کی جیب میں سے ایک چاندی کی موٹی گھڑی کی زنجیر نمودار تھی۔ سر پہ ذرا پُرانی وضع کا ہیٹ تھا اور قریب ہی چھڑی چھتری اور برساتی رکھی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ حفظِ ماتقدم کے خیال سے یہ سب سامان ساتھ لیا گیا تھا۔ ابھی میں دل میں یہ فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ یہ شخص یو۔پی یا پنجاب

کے کسی چھوٹے سے قصبے کا رئیس ہے جو بمبئی کی سیر کو آیا ہے کہ ان حضرت نے پھر:- ع

میں جو روئے قبلہ ہوا کھڑا تو حرم سے آنے لگی صدا

کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بنچ پر جا کر بیٹھ گیا اور جیسے ہی وہ سانس لینے کے لئے رُکا کہ میں نے "معاف کیجئے" کہہ کر دخل در معقولات شروع کر دیا۔ "معاف کیجئے۔ مگر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آپ یہ مصرع غلط پڑھ رہے ہیں۔ اصل میں اقبال مرحوم نے لکھا تھا ع

"کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا"

میں سمجھتا تھا کہ یہ شخص مجھ کو ڈانٹ دے گا کہ تم کون یہ اعتراض کرنے والے مگر اُس نے ملائمت سے جواب دیا "شکریہ، مگر مجھے تو اسی طرح یاد ہے" اور پھر مُسکرا کر "آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں غلط مصرع پڑھ رہا ہوں"

"میرا مکان قریب ہی ہے۔ آپ وہاں چلئے تو میں آپ کو "بانگ درا" میں دکھا سکتا ہوں"

اُمید کے خلاف وہ فوراً ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا راستے میں باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اُردو، انگریزی ادب سے بخوبی واقف ہے۔ میں نے پوچھا آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے تو اُس نے بلا تکلف جواب دیا۔ "واقعہ یہ ہے کہ میں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں نہیں پڑھا۔ میری والدہ مجھے دُور بھیجتے ہوئے گھبراتی تھیں۔

اُنھوں نے گھر پر اُستاد رکھ کر ملیح آباد ہی میں تعلیم دلوائی"، اور پھر طفلانہ سادگی کے ساتھ "آپ نے ملیح آباد کا نام سُنا ہوگا؟ وہاں کا سفیدا آم مشہور ہے۔"

میں نے کہا "بدقسمت ہے وہ شخص جس نے ملیح آباد کے سفیدا آم نہیں کھائے اور میں تو خود کو خوش قسمت لوگوں میں شمار کرتا ہوں۔"

"اے حضت آپ میرے باغ کے سفیدی آم کھائیں تو سفیدے کو بھول جائیں۔ تمام ہندوستان میں صرف میں نے سفیدے میں فجری کی قلم لگا کر سفیدی آم نکالے ہیں۔ اگر ممکن ہوا تو میں آپ کو اگلی فصل میں دو چار ٹوکرے بھیجوں گا پھر آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ سفیدی میں آپ کو فجری کی خوشبو اور نزاکت اور سفیدے کا مزا ملے گا۔"

اس کی باتوں میں عجیب بے تکلفی اور بھولا پن تھا۔ بمبئی جیسے تجارتی شہر میں جہاں ہر شخص چاپلوسی سے دوسروں کا روپیہ اینٹھنا جانتا ہے ایسے آدمی کم ملتے ہیں

"تو آپ آموں کی کاشت کرتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ جب سے زرعی پیداوار کی قیمتیں اتنی گھٹ گئی ہیں کھیتی میں کوئی منافع نہیں رہا۔ ہاں دو چار آموں کے باغ ہیں جن سے کچھ گذارے کی صورت ہو جاتی ہے۔"

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم مکان پہونچ گئے۔ میں نے اپنے ملازم سے چار

بنائے کو کہا اور کتابوں کی الماری میں سے "بانگ درا" نکال کر اپنے دعویٰ کی تصدیق کر دی کہ اصل مصرع "کبھی قبلہ رو جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا" ہے یہ دیکھ کر وہ کھسیانا سا ہو گیا اور کہنے لگا "معاف کیجئے گا میری جہالت کی وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی"۔

میں نے موضوع بدلنے کے لئے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ چار آنے پر ہم دونوں آرام سے بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔

وہ اس قدر صاف گو واقع ہوا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اس کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ اس کا نام شکور تھا۔ والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ گھر کی جائداد کافی تھی۔ اس لئے معاش کی فکر نہ تھی خاندان میں دو ہی فرد تھے وہ اور اس کی والدہ، جن کو بیٹے سے اس قدر محبت تھی کہ آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ اس لئے اسکول یا کالج میں بھی پڑھنے نہ بھیجا بلکہ گاؤں ہی میں گھر پر اُستاد رکھ کر بیٹے کو مکمل تعلیم دلائی۔ یہی وجہ تھی کہ شکور کا مطالعہ وسیع تھا اور علم واقفیت بھی کافی تھی مگر اس پر وہ ظاہری رنگ روغن نہ تھا جو کالج میں چڑھتا ہے پہلی دفعہ اس کی والدہ نے اتنے لمبے سفر کی اجازت دی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ بمبئی جیسے مصروف اور تیز رو شہر میں آکر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

"آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا اور الماریوں کے قریب

جاکر غور سے کتابوں کے نام پڑھنے شروع کر دیے ایک الماری کے اوپر کے خانے میں میرا نیا ناول "ناگن" بھی رکھا تھا اس نے جلد وہاں سے نکال کر کہا۔ "خوب ناول ہے کیا آپ کو بھی پسند ہے؟"

"کوئی خاص خوبی تو مجھے نہیں نظر آتی" میں نے تکلفاً کہا۔

"تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کیوں نہیں پسند آیا؟"

"اس لئے کہ یہ خود میرا لکھا ہوا ہے"

یہ سُن کر اُس نے ازحد مسرت کا اظہار کیا۔ "اخاہ تو سلیم صحافی کے نام سے آپ ہی ناول اور کہانیاں لکھتے ہیں آپ سے ملنے کا تو بڑا اشتیاق تھا"

سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ہر ماہ مختلف کتب فروشوں سے تمام نئی مطبوعات رسائل وغیرہ منگا کر پڑھتا رہتا ہے ادبی رسائل وغیرہ میں "ناگن" کا کافی چرچا رہا تھا اور پہلے ہی سال ہاتھوں ہاتھ دو ایڈیشن فروخت ہو چکے تھے اس لئے کچھ تعجب نہ تھا کہ اس کے پاس بھی یہ ناول پہونچ گیا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا گویا کوئی سوال کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ پھر بولا۔

"آپ سے اس ناول کے متعلق ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

"شوق سے" میں نے یقین دلایا۔

"کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس میں آپ نے "ناگن" یا اوشا رانی کا کریکٹر جو پیش

کیا ہے وہ ہندوستان ٹاکیز کی سٹار زرینہ کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے:"

مجھے اقرار کرنا پڑا۔ دراصل "ناگن" چربہ تھا زرینہ کی زندگی کا جس میں میں نے ایک کامیاب اور چالاک فلم ایکٹرس کے کردار کو پیش کیا تھا۔

زرینہ اُن عورتوں میں سے تھی جن کی زندگی کا مقصد ایک ناگن کی طرح اپنے حُسن سے لوگوں کو فریفتہ کر کے ان کو ڈسنا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ سچی محبت کرنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتی تھی۔ مگر وہ حسین تھی۔ ازحد حسین وہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گُر جانتی تھی۔ پروانوں کی طرح لوگ اس کے گرد رہتے تھے۔ لیکن اُس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی تھی۔ مگر پھر بھی اُس کے عشاق کی بھیڑ بھاڑ کبھی کم نہ ہوتی تھی۔ جو اس کے جال میں ایک دفعہ پھنس گیا وہ کبھی نہ نکل سکا۔ اس ناگن کے کاٹے کا کوئی منتر ہی نہ تھا۔ یہی سب میں نے اپنے ناول میں لکھا اور میرے دوستوں کی رائے تھی کہ وہ ایک کامیاب قلمی تصویر تھی جس میں زرینہ کے تمام خدوخال نمایاں تھے۔ کمال تو یہ تھا کہ خود زرینہ کو اقرار تھا۔ جس دن "ناگن" شائع ہو کر پہلی بار بازار میں آئی اُس سے اگلے ہی دن اُس نے مجھے ٹیلیفون کیا تھا: "آپ کے ناول پر مبارکباد دیتی ہوں مگر ایک چھوٹی سی غلطی آپ نے کی ہے۔ میرا پسندیدہ رنگ فیروزی نہیں بلکہ آسمانی ہے۔" میرا خیال تھا کہ میرا ناول پڑھ کر وہ ازحد خفا ہو گی۔ ہر شخص سے میری شکایت کرے گی۔ ممکن ہے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ لیکن مذاقِ سلیم

کے اس اظہار سے مجھے سخت تعجب ہُوا۔

"تو آپ مس زرینہ کو ذاتی طور پر جانتے بھی ہوں گے؟" شکور نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" مَیں نے کہا۔ "اخبار نویس اور فلمی ناقد کی حیثیت سے اکثر فلمی ستاروں سے ملنا ہوتا ہے۔ زرینہ میں اور جتنی بُرائیاں ہوں ملنے جُلنے میں وہ بہت با اخلاق اور ملنسار واقع ہوئی ہے۔"

"آپ دل میں سوچیں گے کہ یہ شخص میرے اخلاق سے فائدہ اُٹھا رہا ہے، لیکن کیا آپ مس زرینہ سے میرا تعارف کرا سکتے ہیں؟"

میں نے جواب دینے سے پہلے کچھ توقف کیا۔

فلمی حسینوں کا عشق شمالی ہند کے بہت سے نوجوانوں کو بمبئی کھینچ لاتا ہے اور ان میں سے اکثر حضرات مجھ سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ اُن کی ملاقات کسی فلم سٹار سے کرا دوں۔ مگر میں نے اِس قسم کی ذمہ داری سے ہمیشہ پہلو تہی اختیار کی تھی۔ شکور اتنا سیدھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا کہ اس کو بیوقوف بنانا زرینہ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ میں نے سوچا کہ اس خطرے سے اس کو آگاہ کر دوں۔

"دیکھئے۔ آپ شاید ان فلم سٹار عورتوں سے واقف نہیں ہیں۔ ان سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ خصوصاً آپ جیسے شریف آدمی کے لئے....."

میں نے جُملہ ختم نہ کیا تھا کہ وہ ہنسنے لگا۔ بچوں کی طرح کھلکھلا کر۔ "آپ

ڈریئے مت۔ میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں جتنا شاید آپ مجھے سمجھتے ہیں۔"
اب تو میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ اتوار کو جب زرینہ کے نئے فلم "پریم پجارن" کا افتتاح ہوگا تو میں شکور کو ساتھ لے جاؤں گا اور موقع ملنے پر اس کا تعارف کرا دونگا۔"

(۲)

بمبئی کی فلمی اور صحافی زندگی میں کسی اچھے فلم کا افتتاح ایک دلچسپ موقع ہوتا ہے۔ سٹوڈیو کے مالک سیٹھ صاحب پھولے نہیں سماتے۔ گھڑی گھڑی ٹکٹ گھر کی طرف جاتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ "ٹکٹ ختم ہو گئے" کا بورڈ بھی لگا ہے یا نہیں۔ فلم کے ہیرو صاحب سر میں معمول سے زیادہ تیل ڈالکر، ایک نیا شوخ رنگ کا سوٹ اور "چیختے" ہوئے رنگ کی ٹائی زیب تن کئے ہوئے اور ہالی وڈ کے کسی فلمسٹار کی وضع کی مونچھیں بنائے ہوئے بڑی شان سے ٹہل رہے ہیں کہ تماشائیوں کو ایک دوسرے سے یہ کہنے کا موقع ملے کہ "وہ دیکھو ماسٹر ـــــ کو۔ اس فلم کا ہیرو یہی ہے۔ یار کتنا خوش قسمت انسان ہے زرینہ کے ساتھ ایکٹنگ کرتا ہے۔"

فلمی خواتین بھی آج بہترین لباس میں موجود ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جن ایکٹرسوں نے فلم میں نہایت معمولی کردار کیا ہے۔ وہ سب سے بھڑکدار ساڑھی پہنے ہیں، چہرے پر پاؤڈر اور سرخی لگائے ہیں تاکہ شاید کسی کو یہ دھوکا ہو جائے

کہ ہیروئن یہی ہیں۔ اِن بھڑکدار رنگین تتلیوں کے ردِّ عمل کے لئے اخبار نویس اور تنقید نگار بھی موجود ہیں۔ لباس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بیچارے شکل سے فاقہ زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر چھوٹے موٹے رسالوں کے ایڈیٹر سٹوڈیو کے مالک صاحب کی درباداری کر رہے ہیں سمجھتے ہیں کہ خوشامد سے اشتہار حاصل کر لیں گے۔

زرینہ حسبِ معمول ہلکے فیروزی رنگ کی معمولی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ یہ اُس کی چالاکی تھی کہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتی تاکہ لوگوں پر اپنی معصومیت کا سکّہ جما سکے۔ اس کے گرد ہمیشہ کی طرح پروانوں کا جمگھٹ تھا۔ ایکٹر اخبار نویس، نوجوان تاجر، رئیسوں کے لڑکے سب اُس کے دربار میں موجود تھے۔ میں اور شکور ایک کونے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ زرینہ نے دُور سے دیکھا اور ہماری طرف خود بڑھی۔ میں نے اس کو "پریم پجارن" کی تکمیل پر مبارکباد دی اور یہ موقع مناسب دیکھ کر فوراً شکور کا تعارف کرا دیا۔

"یہ میرے دوست عبدالشکور ہیں۔ آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔"

"اچھا آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں۔ جہاں کے آم مشہور ہیں۔ بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔ مگر یہ تو بتائیے کہ ....." اتنے عرصے میں کسی دوست نے مجھے اشارہ کیا تو میں اُدھر چلا گیا۔ اُس سے باتیں کر کے لوٹا تو

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے شکور اور زرینہ کو بدستور آموں کے متعلق گفتگو میں مصروف پایا۔ وہ کہہ رہی تھی "سچ پوچھئے تو جو شخص آم کی قدر نہیں کر سکتا وہ ہندوستانی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہمارا قومی پھل ہے تو آم ہی ہے۔"

اتنے میں تماشہ شروع ہونے کی گھنٹی بجی اور سب لوگ سینما ہال کی طرف بڑھے۔ زرینہ نے شکور کو اپنے ہمراہ بیٹھنے کی دعوت دی جس پر بہت سی حاسدانہ نظروں نے اُس کو گھور کر دیکھا۔ مجھ کو تعجب ضرور ہوا۔ مگر میں سمجھ گیا کہ یہ معلوم کر کے کہ شکور گھر کا رئیس ہے زرینہ اُس کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ میں اُن سے اگلی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔

روشنیاں گل ہو گئیں۔ پردہ پر زرینہ کا نام جب آیا تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ فلم شروع ہو گیا۔ معمولی قسم کا فلم تھا۔ وہی پرانی کہانی جو "دیوداس" کے بعد سے نوّے فی صدی ہندوستانی فلموں میں ہوتی ہے۔ ایک تھا لڑکا ایک تھی لڑکی دونوں میں پریم تھا۔ والدین دوسری جگہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ دونوں گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے مختلف مصیبتیں پڑیں۔ درجن بھر گانے گائے گئے۔ عین اِس موقعہ پر جب لڑکے کے والدین اپنی رضامندی دینے پر تیار ہوئے تھے وہ ایک گانا گاتا ہوا رخصت بہ ملک عدم ہوا لڑکی اُس کی یاد میں سنیاسی ہو گئی۔ کہانی جیسی بھی ہو زرینہ کی اداکاری

معمول سے زیادہ کامیاب تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے آرٹ کا تمام نچوڑ اس فلم میں پیش کر دیا ہے۔ "پریم پجارن" بلاشک اُس کا بہترین فلم تھا مگر میں تماشہ سے محظوظ نہ ہو سکا کیونکہ تمام عرصہ شکور اور زرینہ باتیں کرتے رہے وہ دلچسپ باتیں کرنے میں کمال رکھتی تھی۔ لیکن اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اُس کو کبھی نہ سُنا تھا۔ شکور اس کو اپنے باغ اپنے کھیت اپنے گاؤں کے حالات سُناتا رہا۔ لکھنؤ کے قابلِ دید مقامات گنائے۔ زرینہ نے اپنے بچپن کے واقعات دُہرائے فلم اسٹاروں کی طرح نہیں کہ "بچپن سے میں محسوس کرتی تھی کہ میری روح اداکاری ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتی ہے۔" بلکہ بچوں کی طرح "ارے میں بھی لڑکپن میں بڑی شریر تھی ہمسائے میں آم کا درخت تھا جب سب سو جاتے ہیں چپکے سے اُٹھ کر کچی کچی کیریاں چُرا لاتی جس کی کبھی چٹنی بنتی کبھی اچار ——"

تماشہ ختم ہوا تو میں اِس مسئلہ پر غور کر رہا تھا کیا نفسیات کا مکمل ماہر بھی عورت اور اُس کی نسوانی گہرائیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ رخصت ہوتے وقت زرینہ نے شکور کو دوبارہ ملنے کی دعوت دی اور مجھ سے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے شکور صاحب سے ملاقات کرائی۔"

(۳)

عجیب اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے بعد شکور یا زرینہ سے کئی مہینے

ملاقات نہ ہو سکی۔ شکور میرے مکان پر ایک بار آیا مگر میں باہر تھا پھر میں چند ماہ کے لئے دنیا کی سیاحت کے لئے نکل گیا۔ جب میں واپس بمبئی پہنچا تو مکان پر ڈاک کا ایک انبار تھا۔ میں نے پہلے چند فلمی رسالے کھول کر دیکھنے شروع کئے تاکہ تازہ ترین فلمی خبریں پڑھوں۔ "فلم نامہ" کے پہلے ہی صفحے پر کیا دیکھتا ہوں کہ زرینہ اور شکور کی اکٹھی تصویر جس کے نیچے لکھا تھا۔ ہندوستان کی مایۂ ناز اداکار زرینہ اور اُن کے شوہر عبدالشکور" یہ دیکھ کر مجھ کو ایسا محسوس ہُوا جیسے میرے ساتھ سخت دغا کی گئی ہے اور واقعہ بھی یہ تھا شکور کے ساتھ شادی کر کے زرینہ نے پوری اُس تصویر کو غلط ثابت کر دیا جو میں نے "ناگن" میں پیش کی تھی۔ میرے دماغ میں دُور دُور بھی یہ گمان نہ گذرا تھا کہ وہ شکور جیسے سیدھے اور غیر دلچسپ انسان کے ساتھ شادی کرے گی۔ اُس نے بڑے بڑے رئیسوں، تاجروں، ادیبوں اور شاعروں کو ٹھکرا دیا تھا اگر وہ کسی کلرک، کسی نائب تحصیلدار، کسی فاقہ زدہ اخبار نویس سے بھی شادی کر لیتی تب بھی مجھے اتنا تعجب نہ ہوتا۔ زرینہ حسین فسوں کار چالاک زرینہ..... اور شکور بیچارہ سیدھا سادا دیہاتی شکور! دونوں تصویریں گویا میری پریشانی اور استعجاب پر مسکرا رہی تھیں۔

خط کھول کر پڑھنے شروع کئے۔ کتب فروشوں کے بل۔ درزی کا بل، مالک مکان کا بل، بجلی کا بل، پانی کا بل، رسالوں کے اڈیٹروں کے

تقاضے کہ مضمون یا افسانہ بھیجو، اُن شادیوں کے رقعے جو کئی مہینے ہوئے ہو چکی تھیں، پرانے دعوت نامے اور اُن ہی میں ایک خط شکور اور زرینہ دونوں کی طرف سے۔ صرف چند سطریں تھیں۔ ہم دونوں بہت مشکور ہوں گے اگر آپ چند روز کے لئے ملیح آباد آ کر ہمارے ساتھ ٹھہریں، سفیدی آم آپ کے منتظر ہیں۔ مخلص شکور اور زرینہ۔"

میں نے طے کر لیا کہ میں اس راز کی تہ تک پہونچنے کے لئے ملیح آباد ضرور جاؤں گا۔ دوسرے اخبار پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ زرینہ نے سٹوڈیو کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ "پریم پجارن" اس کا آخری فلم تھا۔

اگلے مہینے کسی کام سے لکھنؤ جانا ہوا تو میں تار سے اطلاع دے کر ملیح آباد پہونچ گیا۔ شکور اور زرینہ دونوں سٹیشن پر لینے آئے۔ زرینہ اب ایک سادے غرارے اور دوپٹہ قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کے چہرے پر سُرخی تھی۔ غازہ کی نہیں بلکہ صحت کی علامت۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر از حد خوش ہوئے۔ گھر لے جا کر اتنی خاطر کی اور اتنے آم کھلائے کہ میں دو چار ہی دن میں پریشان سا ہو گیا۔ ان دونوں کی زندگی قابلِ رشک تھی۔ شکور ہر صبح کو اپنے باغ اور کھیتوں کی نگرانی کرنے کے لئے جاتا۔ زرینہ گھر کا کاروبار دیکھتی۔ کبھی کبھی وہ باغ میں پہونچ جاتی اور پھر دونوں ساتھ ساتھ واپس آتے باغ اور کھیتوں سے ملا کر کوئی بہت آمدنی معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اُن کو اس کی

کوئی فکر نہ تھی۔ ایک سابق فلم سٹار کو اس دیہاتی ماحول میں دیکھ کر تعجب ضرور ہوتا تھا۔ مگر زرینہ کے طرزِ عمل سے یہ بالکل نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں نو وارد ہے بلکہ ایسا ظاہر ہوتا تھا گویا اُس کی تمام عمر یہیں کٹی ہے۔

جب مجھے یہاں رہتے ایک ہفتہ ہو گیا۔ تو میں نے باصرار ان دونوں سے واپسی کی اجازت حاصل کی۔ جس شام کو میں روانہ ہونے والا تھا، دوپہر کے کھانے سے فراغت پا کر میں نے ہمت کر کے سوال کر ہی ڈالا جو مجھے اتنے عرصے سے پریشان کئے ہوئے تھا۔

"ایسا سوال کرنا بد تہذیبی تو ضرور ہے" میں نے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اُمید ہے معاف کیا جاؤں گا، مگر پھر بھی پوچھنا پڑتا ہے کہ . . .

. . . . ." کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح سے فقرہ پُورا کروں۔

شکور نے مسکرا کر زرینہ کی طرف دیکھا اور وہ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوئی:-

"آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں نہ کہ ایک ناگن گھریلو بلی کیسے بن گئی؟"

میں نے گردن کے اشارے سے 'ہاں' کہا

"اگر آپ ایک سابق فلم سٹار کا یقین کر سکتے ہیں تو میں کہوں گی کہ وہ ناگن دراصل ہمیشہ گھریلو بلی ہی تھی۔ ناگن کا رُوپ اس لئے تھا کہ فلمی دنیا میں معصوم خُرخُر کرتی ہوئی بلیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس رُوپہلی نظر فریب ماحول میں دھوکا ہی اصلیت ہے اور سوانگ روزمرہ کا دستور۔

اگر میں ظاہرا بھی ایک سیدھی سادی دیہاتن رہتی تو کامیابی کا دروازہ میرے لئے ہمیشہ بند رہتا۔ اس کے علاوہ معاف کیجئے گا آپ کے ہم پیشہ حضرات نے فلم ایکٹرسوں کو اس قدر بدنام کیا ہے کہ اگر میں تصنع سے کام نہ لیتی اور سادہ برتاؤ رکھتی تب مجھے اور بھی زیادہ عیار اور چالباز سمجھا جاتا۔"

تو میں نے جو کچھ اپنے ناول "ناگن" میں لکھا تھا وہ ......"

"وہ بالکل غلط تھا۔" تنکو رینہ بیچ میں بول پڑا۔ اور پھر مسکراتے ہوئے۔ "وہ تو میں ناول پڑھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔"

"تو آپ کا مطلب ہے کہ آپ بغیر ملے اپنی بیگم صاحبہ کے کردار کو اتنا پہچانتے تھے؟"

میں زرینہ کو تو نہ جانتا تھا مگر ہندوستانی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھا۔ آپ نے ناگن کا کیریکٹر جو پیش کیا تھا وہ ناممکن الوجود تھا۔ انسان خواہ فلم سٹار ہو یا مولوی اس میں انسانیت کا جوہر مفقود نہیں ہوتا۔ ناگن کے ظاہری روپ کو تو آپ نے ضرور دکھایا مگر آپ یہ نہ معلوم کر سکے کہ اس کا دل آخر عورت کا دل تھا۔ آپ کا ناول غلط نہیں تھا مگر وہ ایک ایسی تصویر کی طرح تھا جو بذاتِ خود صحیح ہو مگر الٹی لٹکا دی گئی ہو۔"

میں چند لمحے کے لئے خاموش بیٹھا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری نظر سے ایک پردہ ہٹ گیا ہے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ناگن کے کردار پیش کرنے

میں میں کتنی غلطی پر تھا۔ موضوع بدلنے کے لئے میں نے زرینہ سے سوال کیا۔ "تو کیا آپ نے فلمی دُنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا؟"

"جی ہاں۔" اُس نے جواب دیا۔ "مگر اس لئے نہیں کہ یہ بُرا کام ہے یا مخرب الاخلاق ہے۔ ہر پیشہ بُرا ہو سکتا ہے اگر اُس میں بُرے لوگ لئے جائیں گے۔ مگر ہر اداکار کو اپنی کامیابی کے معیار پر پہنچ کر اپنی زندگی ختم کر دینا چاہیئے۔ ورنہ ایک دن خود سٹوڈیو والے اس سے استعفےٰ طلب کریں گے۔"

اتنے میں زنانخانے سے ایک نحیف آواز آئی۔ "زرینہ بیٹی یہ پان لے جاؤ۔"

"میری والدہ!" شکور نے کہا جب زرینہ اُٹھ کر گئی۔ "آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ زرینہ نے چند ہی روز میں اتنی قدامت پسند خاتون کو بھی خدمت سے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔"

اس شام کو میں رخصت ہو کر لکھنؤ واپس آیا اور وہاں سے بمبئی کے لئے ٹرین بدلی۔ سٹیشن پر ایک کتب فروش لڑکا اور ناولوں کیساتھ "ناگن" بھی بیچ رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "صاحب یہ ناول لیجئے۔ بہترین ناول ہے۔ بس دو جلدیں رہ گئی ہیں۔"

میں نے دونوں جلدیں خرید لیں اور جب ٹرین روانہ ہو گئی تو اُن کو درجے سے باہر پھینک دیا۔

یہی وجہ ہے کہ باوجود پہلے ایڈیشنوں کی اتنی مقبولیت کے "ناگن" کا تیسرا ایڈیشن شائع نہ ہوا اور نہ ہو گا۔

پہلا پتھر

"اِس گنہگار عورت پر پہلا پتھر وہ چلائے جس نے خود کبھی گناہ نہ کیا ہو (حضرت عیسیٰؑ)

(۱)

رام گڈھ کلب میں ٹینس ہو چکی تھی اور ممبر جنمیں شہر کے معزز خواتین اور حضرات شامل تھے۔ برقی روشنی سے منوّر ڈرائنگ روم میں ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں آ رہے تھے۔ چند نے تاش سے شوق کرنا شروع کیا، ایک گنجے پروفیسر نے اپنی توجہ ریڈیو کی طرف مبذول کی اور باقی سب آرام سے صوفوں پر لیٹ کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دروازہ زور سے کھلا اور مسز سمتھ، شہر کی لیڈی ڈاکٹر داخل ہوئیں۔

"ہلو ڈاکٹر صاحبہ" مسز سنگھ نے پوچھا "کہاں رہیں؟ ٹینس پر تو آپ کا انتظار ہی رہا"

مسز سمتھ ابتک ہانپ رہی تھیں۔ کچھ تو اپنے قدرتی موٹاپے کی وجہ سے، وہ تھوڑا سا چل کر بھی تھک جاتی تھیں، اور کچھ اُنکے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک نہایت اہم خبر کی حامل ہیں جس کے گراں بوجھ نے اُنکی تکان میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مسز سمتھ

اس فیاض طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں جو ہمیشہ اپنے رازمیں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ اپنے پیشہ کی اہمیت جتانے میں بھی اُن کو خاص خوشی حاصل ہوتی تھی۔

کیا بتاؤں یہ پیشہ ہی ایسا ہے۔ گھڑی بھر کی فرصت نہیں ملتی۔ بڑی مشکل سے فراغت پاکر آئی ہوں۔" اور پھر اپنے قریب بیٹھی ہوئی خاتون کی طرف مخاطب ہوکر۔ "تم نے کچھ اور بھی سُنا؟"

یہ سوال اُنہوں نے ایسی آواز میں کیا کہ سب نے سُن لیا۔ مسز سمتھ اپنی دشنام طرازی کے لئے مشہور تھیں اور اپنے کام کے سلسلہ میں اکثر لوگوں کے متعلق "دلچسپ واقعات" ان کے علم میں آتے تھے جن کو کلب میں بیان کرنا وہ اپنا فرضِ اوّلین سمجھتی تھیں۔ گنجے پروفیسر نے ریڈیو بند کر دیا۔ تاش کھیلنے والوں نے بازی فی الحال ملتوی کر دی۔ مردوں نے اپنی اپنی ٹائیوں کو درست کیا اور عورتوں نے اپنی ساڑیوں پر سے شکنوں کو دور کیا اور سب ہمہ تن گوش ہوکر مسز سمتھ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اپنے پیشے کے اصول کے مطابق، مجھے یہ بیان تو کرنا نہیں چاہیئے مگر کلب کے ممبر کی حیثیت سے مجھے لازم ہے کہ آپ کو اِس واقعہ سے مطلع کر دوں کیونکہ ایسے واقعات سے کلب کی بدنامی ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ مسز ٹامس کو کلب سے نکال دیا جائے۔"

مسز سمتھ دلچسپی میں اضافہ کرتے اور اپنا گلا صاف کرنے کے لئے ٹھیر گئیں۔

ایولن ٹامس میونسپل اسکول میں ایک نوجوان معلّمہ تھی اور ایک مہینہ ہُوا کلب میں بعض ممبران کی سفارش پر داخل کی گئی تھی۔ اس کے داخلہ ہی پر کافی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ کیونکہ وہ ایک کم تنخواہ معلّمہ تھی۔ اُس کے خاوند کو جو کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اکثر خواتین کا خیال تھا کہ اس کا کلب میں ممبر کی حیثیت سے داخلہ اُن کی ہتک تھی۔ بھلا کہاں فوق البھڑک ساڑھیاں پہننے اور موٹر میں پھرنے والیاں، کہاں وہ ساٹھ روپے کی اُستانی۔ مگر اُن کی خفگی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ باوجود ان کے شاندار کپڑوں اور غازہ اور سُرخی کے استعمال کے ایولن ٹامس سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔

"ہاں تو کیا ہُوا مسز سمتھ؟ مَیں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس کمبخت کو داخل نہ کیا جائے۔" ایک خاتون نے کہا۔ یہ بوڑھے اور گنجے پروفیسر اندرسین کی نوجوان بیوی موہنا تھیں۔ تعلیم تو معمولی ہوئی تھی، مگر رام گڈھ کی سوسائٹی کی تتلیوں سے بڑھیا ساڑھیاں پہننا اور فرانسیسی سامانِ زیبائش کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ انگریزی ٹوٹی پھوٹی بولتی تھیں مگر بالکل فرانسیسی انداز میں جیسے کہ کوئی خاص پیرس کی حسینہ انگریزی بولنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

مسز سمتھ نے آرام لیکر پھر سلسلہ بیان شروع کیا۔ "کیا بتاؤں مجھے تو سناتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ مگر کلب کی بہبودی کے خیال سے آپ کو اطلاع بھی دینی ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ کو شاید یاد ہوگا ایولن کی شادی

چھ مہینے ہوئے ہوئی تھی۔ اور آج اُس کے بچّہ پیدا ہوا ہے۔"

"کیا؟"

"ہاں؟"

"واقعی؟"

"لاحول ولاقوّۃ"

"توبہ۔ توبہ۔"

یک دم چاروں طرف سے یہ آوازیں بلند ہوئیں اور مسز سمتھ آرام سے صوفے پر لیٹ کر لوگوں کے چہروں کا مطالعہ کرنے لگیں۔

"میں تجویز کرتی ہوں کہ ایولن ٹامس کو فوراً نکال دیا جائے۔ ایسی عورت کا ممبر رہنا کلب کی ذلّت ہے۔"

تجویز پیش کی مسز اندرسین نے، موافقت ایک نوجوان انجنیئر رام لال نے کی اور بالاتفاق فوراً پاس ہو گئی۔

الگ صوفوں پر اسی واقعہ کے متعلق آہستہ آہستہ گفتگو شروع ہو گئی۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ مسز سمتھ کی خبر نے کلب کی فضا میں ایک بے لطفی پیدا کر دی تھی پروفیسر فلسفیانہ انداز میں ریڈیو کے ساتھ کھیل رہا تھا، کچھ لوگ اخباروں کی تصویروں پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

رام لال انجنیئر نے مسز اندرسین کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا

جس کا جواب ایک خفیف سی مسکراہٹ سے پا کر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا ۔۔۔۔ !

"اچھا اب میں تو اجازت چاہتا ہوں"۔ اُس نے اوور کوٹ پہنتے ہوئے کہا اور پروفیسر کی طرف مخاطب ہو کر، "پروفیسر صاحب چلیئے آپکو کار میں پہنچاتا جاؤں "۔

"ہیں ؟ نہیں شکریہ ۔ میں تو دس بجے ریڈیو پر خبریں سُن کر جاؤں گا" پروفیسر نے بیدار ہو کر کہا۔ "مگر ہاں مہربانی فرما کر موہنا کو پہنچاتے جایئے۔ وہ جانا چاہتی ہوگی"۔ جانے سے قبل موہنا نے پھر ایولین ٹامس کے متعلق کلب کے سکرٹری مسٹر اختر حسین سے کہا: "اچھا تو اختر صاحب آپ آج ہی ایولین ٹامس کو اطلاع دیدیجئے کہ اس کو کلب کی ممبری سے خارج کر دیا گیا ہے ۔ ہم ایسی آوارہ عورتوں کو نہیں رکھ سکتے"۔

"کیوں موہنا"۔ رام لال نے ایک ہاتھ سے موٹر چلاتے ہوئے اور دوسرے کو موہنا کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا: "اگر پروفیسر کو معلوم ہو جائے تو کیا ہو"؟ موہنا نے اس کا جواب ایک پیار بھری چپت سے دینا مناسب سمجھا۔

(۲)

"آج منشی برق اب تک نہیں آئے"۔ رات کا ایک بجا تو لچھمی طوائف نے اپنے اُستاد جی سے پوچھا۔

بوڑھے استاد جی نے جواب دیا: "تعجب ہے ۔ ایسی دیر تو اُن کو ہوتی نہیں ہے کبھی ۔ وہ تو بارہ کے بعد ہی آجاتے ہیں ۔ اچھا تو اب میں تو چلا

آئیں گے بھی تو اب گانا کیا سُنیں گے۔" یہ کہہ کر وہ تو چلتے بنے۔

"میں بھی اب جاکر سوتی ہوں۔" لچھمی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "اب کب تک اُن کا انتظار کروں۔"

"جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں چند منٹ اور ٹھہر جاؤ۔" بوڑھی جہاندیدہ نائکہ بولی۔

وقت کاٹنے کے لئے لچھمی نے ہارمونیم بجانا شروع کر دیا۔ لچھمی خوبصورت نہ تھی۔ عمر بھی ۳۵ سے کم نہ تھی۔ گناہ کی زندگی سے چہرے پر ایک پھٹکار سی برسنے لگی تھی۔ مگر پوڈر و غازہ کی مدد سے بجلی کی سُرخ روشنی میں جب بیٹھتی تو کوئی نہ کوئی گاہک پھنس ہی جاتا تھا۔ گانا اچھا جانتی تھی اس لئے ناچ مجرے سے بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ منشی برق اُس کے پُرانے چاہنے والوں میں تھے اور اپنی عاشقی کو پندرہ برس سے نباہے جا رہے تھے۔ وہ شہر کے ایک ہفتہ وار اخبار "خناس" کے اڈیٹر تھے، جس کی پالیسی "سرکار کی وفاداری، اسلام کی اخلاقی و مذہبی روایات کو قائم رکھنا اور نئی روشنی کی تباہی سے قوم کو بچانا" تھی شہر کے پُرانے خیال کے طبقے میں اُن کی کافی عزت کی جاتی تھی۔ ضلع کے دربار میں اُن کو کرسی ملتی تھی۔ اکثر اوقاف کے متولیوں میں تھے۔ اس لئے کم از کم ظاہرداری کا تقاضہ تھا کہ دن دہاڑے طوائف کے مکان پر چڑھتے نظر نہ آئیں۔ اُن کے آنے کا مقررہ وقت بارہ بجے تھا۔

اب ڈیڑھ بج گیا تھا۔ نائکہ نے بھی اب لچھمی سے کہا۔ "بس اب جاکر سو رہو منشی جی کو کوئی کام ہوگیا ہوگا۔" لچھمی ہارمونیم بند کرکے اُٹھنے ہی والی تھی کہ زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی اور منشی برق ہانپتے کانپتے داخل ہوئے۔

پچاس سے اُوپر عمر، پشاخہ ڈاڑھی، اس میں گھٹیا خضاب سے قوسِ قزح کے رنگ۔ سر پر پٹے۔ ان میں سیروں تیل پڑا ہوا۔ سر پر چوگوشہ مخمل کی ٹوپی۔ ریشمی شیروانی۔ سلیم شاہی جوتا۔ منشی برق اچھے خاصے چڑی کے غلام معلوم ہوتے تھے۔

سانس قابو میں آیا تو بولے "ارے لچھمی بیٹھو۔ کھڑی کیوں ہو" نائکہ سے پان کی فرمائش کی اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی معاف کرنا۔ مجھے آج ذرا ضروری کام ہوگیا تھا۔ اس لئے دیر ہوگئی۔"

لچھمی تجربہ کار طوائف تھی۔ اِس موقع سے فائدہ اُٹھاکر بولی۔

"جی ہاں۔ آپ کو ہمیشہ کام ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ اتنی رات گئے بھلا کیا کام تھا۔ کسی اور کوٹھے پر گئے ہوں گے۔"

منشی برق نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ "ارے ہاں! اِس عمر میں ضرور کہیں اور جاؤں گا! بھلا پندرہ برس سے جب سے ہماری تمہاری ملاقات ہے کبھی سُنا ہے کہ میں کہیں اور گیا۔"

"اچھا تو پھر بتاؤ کہاں گئے تھے؟" لچھمی نے اصرار کیا۔

منشی جی نے پہلو بدلا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرا، ٹوپی اُتار کر رکھی اور جواب دیا۔ "ارے لو تمہیں نہیں تو کسے بتاؤں گا۔ بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ پہلے ایک پان اپنے ہاتھ سے کھلاؤ تو شروع کروں۔"

لچھمی نے پان دیا اور منشی صاحب نے اپنے زرد پائیریا زدہ دانتوں میں دبایا۔

"بات یہ ہوئی۔" اُنہوں نے کہنا شروع کیا۔ "کہ آج اپنے اخبار کے لئے بہت بڑھیا مواد ہاتھ آیا ہے۔ کلب کے خانساماں سے معلوم ہوا۔ وہاں بھی اسی کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ وہ عیسائی چھوکری مسز ٹامس ہے نا، سکول میں پڑھاتی ہے۔ اسکے متعلق ایک ہفتہ ہوا اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور۔" منشی جی نے آنکھ مار کے کہا۔ "شہر کے گرجا کے پادری کا رجسٹر کہتا ہے کہ شادی صرف پانچ مہینے ہوئے ہوئی تھی۔ کیوں کیسی رہی؟ تو میں اُسی کے متعلق تحقیقات کر رہا تھا۔ پادری سے ملا، اُس کا رجسٹر دیکھا۔ سکول کے ملازمین سے پوچھا، لیڈی ڈاکٹر سے ملا۔ تب جا کر یہ مواد دستیاب ہوا ہے۔ پرسوں پرچہ نکلنے کا دن ہے۔ سوچا کہ مضمون بھی لکھ لوں۔ سُنو گی؟ جیب ہی میں ہے۔۔۔۔"

لچھمی اور اُس نائکہ دونوں نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ منشی جی نے جیب سے کچھ کاغذ نکالے، ایک دقیانوسی عینک ناک پر رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اخبار "خناس" کی پالیسی کے مطابق ہم ہمیشہ بے پردگی فیشن اور عورتوں کی تعلیم کے مضر اثرات کو عوام پر ظاہر کرتے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے اکثر بے پردہ طبقہ کی بدمعاشیوں اور بداعمالیوں کی مثالیں بھی ناظرین کے سامنے پیش کی ہیں تاکہ مسلمانوں پر بے پردگی اور تعلیم نسواں کے خطرات عیاں ہو جائیں۔ چند ماہ کا عرصہ ہوا ہم نے مخلوط کلب کی رنگ رلیوں کا ذکر کیا تھا۔ مگر آج ہمارے علم میں اس سے بھی زیادہ سنگین واقعہ آیا ہے جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ عورتوں کو بے پردہ رکھنے اور اُن کو آزادی دینے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ شہر کے گرلز اسکول میں ایک نوخیز عیسائی اُستانی ہیں۔ مسز ٹامس جن کی خانہ آبادی شہر کے گرجا میں پانچ ماہ ہوتے ہوئی تھی۔ اور آج تہذیب جدید کی برکت سے اُن کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے!۔۔۔۔"

لچھمی اور اُس کی نائکہ نے ایک قہقہہ مارا اور منشی جی نے فاتحانہ انداز سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا مضمون جاری رکھا۔

"کیا اس واقعہ کے بعد بھی شہر کے شریف مسلمان اپنی لڑکیوں کو گرلز سکول میں پڑھنے کے لئے بھیجیں گے۔ جہاں اُستانیاں ایسی ہوں گی وہاں کی لڑکیوں کا کیا حال ہوگا؟ ہم گرلز سکول کی مینجنگ کمیٹی اور خصوصاً اور اُس کے صدر رائے بہادر موہن لال سے سوال کرتے ہیں کہ اُن کو اس واقعہ کا علم ہے؟۔۔۔۔"

رائے بہادر موہن لال نے تیسری بار (۳) "خناس" کے مضمون کو پڑھا اور میز پر رکھ دیا

رائے بہادر موہن لال دس لاکھ روپیہ نقد، تین کوٹھیوں، چار باغات اور ایک توند کے مالک تھے۔ عزت اور شہرت دولت کی لونڈیاں ہیں۔ رائے بہادر موہن لال نے اپنی دولت اپنے دو بھتیجوں کی جائداد غصب کر کے اور رشوت کے ذریعے حاصل کی تھی۔ لیکن اب تو اُن کا شمار شہر کی معزز ہستیوں میں ہوتا تھا۔ آنریری مجسٹریٹ، میونسپلٹی کے صدر، ہندو دھرم سیوک سنگھ کے سیکرٹری اور پچھلے سال سے جب اُنہوں نے دس ہزار نقد چندہ دیا تھا۔ رام گڈھ گرلز سکول کی مینجنگ کمیٹی کے بھی صدر۔ رائے بہادر صاحب نے اپنی چکنی توند پر ہاتھ پھیرا جو چکن کے کرتے میں سے چمک رہی تھی، ایک ڈکار لی، اور چوتھی بار پڑھنے کے لئے "خناس" اُٹھایا ہی تھا کہ ان کے لنگوٹیا یار خان بہادر چھٹن میاں صاحب داخل ہوئے۔ اُنکے ہاتھ میں ایک "خناس" کا پرچہ تھا۔ خان بہادر چھٹن خاں ایک خاندانی رئیس تھے ان کے دادا کے ہاں چھ ہاتھی اور چھ طوائفیں تھیں۔ ان کے والد کے پاس ایک گھوڑا اور فقط ایک ہی خانہ زاد تھی۔ چھٹن خاں کو ہمیشہ افسوس رہا کہ اجناس کی گرانی کے سبب وہ کبھی ایک طوائف گھر پہ نہ رکھ سکے۔

"ارے یار یہ کیا لکھا ہے؟" خان بہادر صاحب نے بیٹھتے ہی فرمایا۔

"میں نے خود بھی پڑھا ہے سخت بدنامی کی بات ہے، سکول کی ناک کٹ گئی" رائے بہادر نے جواب دیا

"ارے جناب تمام شہر میں چرچا ہے لوگ کہتے ہیں ہم اپنی لڑکیوں کو ایسے سکول میں نہیں بھیجیں گے" خان بہادر صاحب بولے۔ "آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا بھئی۔ اب مینجنگ کمیٹی کے سامنے معاملہ رکھنا پڑیگا" رائے بہادر صاحب نے فرمایا

"مگر ایسی عورت کو تو آپ کو ایک منٹ سکول میں نہ رکھنا چاہئے" خان بہادر صاحب نے کہا۔ "ورنہ اپنا سکول خالی ہوا سمجھئے" آخر آپ کو بھی تو بہ حیثیت صدر مینجنگ کمیٹی کچھ اختیارات ہیں"

"تو کیا فوراً نکال دوں"

"اور کیا۔ اگر اپنے سکول کی خیریت چاہتے ہیں"

"مگر اس سے پوچھ تو لیا جائے"

"ارے میاں اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ نکال باہر کرو سالی کو"

رائے بہادر صاحب کو بھی اپنے سکول کی نیک نامی کی بہت فکر رہتی تھی کیونکہ اس کی بدنامی سے اُن کی بدنامی ہوئی تھی اس لئے اُنھوں نے وہیں کاغذ قلم منگا کر مسز ٹامس کی برخواستگی کا حکم لکھ اُس کے گھر بھجوا دیا۔

جب خط لے کر نوکر روانہ ہو گیا تو رائے بہادر صاحب نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔ "کم بخت اگر اس تماش کی تھی۔ تو آخر ہم لوگوں نے کیا قصور کیا تھا کہ محروم رہے"

(۴)

"ارے بس ہنسی بند کرو"

ایولن کو غصہ آ رہا تھا اور اُس کے خاوند کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

"میری نوکری چلی گئی اور تم ہو کہ ہنسے جا رہے ہو۔" اُس نے اُس کے بال کھینچتے ہوئے کہا۔

"یہ شہر کم بخت اس قابل نہیں ہے کہ تم یہاں رہو۔" ٹامس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "اب میں اپنی ایولن کو یہاں چھوڑوں گا ہی نہیں۔"

"تو تمہارے پچاس روپے پر کیسے دونوں گزارہ کرینگے؟ اور ان لوگوں کو دیکھو کہ مجھے بلا کر پوچھا تک نہیں۔ اس ذلیل چیتھڑے "خاص" کے لکھنے پر مجھے نکال دیا۔ میں کل ہی اپنی پہلی شادی کا سرٹیفکیٹ لے جا کر رائے بہادر کو دکھاؤں گی۔"

"وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اس سے ملنے جاؤ۔ تمہاری پاک بازی کا انحصار رائے بہادر موہن لال کی رائے پر نہیں ہے۔ نہ رام گڑھ کلب کی ممبری پر۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس جگہ کی فکر ہی نہ کرو۔ اور کل صبح ہی میرے ساتھ دہلی چلو۔ بھلا رام گڑھ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ رہی ہماری شادی تو وہ ہمارا فعل ہے ہم خواہ دس دفعہ شادی کریں۔ کہو تو دہلی میں تیسری دفعہ گرجا میں جا کر نکاح پڑھائیں۔"

"مگر ایولن! یاد ہے جو مزہ اس خفیہ شادی میں آیا تھا کس طرح تم گھر سے چھپ کر آئی تھیں اور گرجا میں جب پادری بائیبل پڑھ رہا تھا اور تم کانپ رہی تھیں....."

"یہ سب تو ہے لیکن میں کہتی ہوں۔ دہلی جیسے شہر میں ہم کیسے تمہاری تنخواہ

پر گذارہ کریں گے۔"

ٹامس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "ارے میری منی میں نے تجھے ابھی یہ تو بتایا ہی نہیں۔ مجھے اپنے دفتر کی ہیڈ کلرکی مل گئی ہے اب تو روپے تنخواہ ملے گی سو روپے....."

"افوہ۔ سچ بتاؤ" ایولن نے خوشی سے ٹامس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو۔ اور ابھی پوری بات تو سنو۔ کوئن الزبتھ ہائی سکول کی ہیڈ مسٹرس سے میں ملا تھا۔ اُس نے کہا ہے کہ اُس کے ہاں ایک اُستانی کی جگہ خالی ہے یقین ہے تمھیں وہ لے لے گی۔"

"ارے سچ!" ایولن خوشی کے مارے سُرخ ہو گئی۔ "اب تو کل ہی اِس منحوس شہر سے بھاگ چلو۔"

ہاں" ٹامس نے جواب دیا۔ "مگر کچھ اور بھی یاد ہے آج ہماری پہلی شادی کی سال گرہ ہے اِس کا تو جشن منانا چاہیئے۔"

اِسی رات محلہ داروں کا سونا حرام ہو گیا۔ گراموفون پر گانے کے ریکارڈ، ٹامس اور ایولن کے قہقہے اور اُن کے بچے کے رونے نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

اَبابیل

اس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھاتے نہ جانور پر۔ ایک دن رامو لہار کے بچے نے اس کے بیل کی دم میں کانٹے باندھ دیئے تھے تو مارتے مارتے اس کو ادھ موا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی، تو لاٹھی لیکر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کمبخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اسکی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو کہدیا: "ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے۔" بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے

لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیئے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دیکر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا: "کیوں بے نتھو، تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورے کریگا۔ اور ابے چھدو تیری بھی شامت آئی ہے کیا؟" اور پھر ان غریبوں کی شامت ہی آجاتی۔ سوت کی رسّی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچّوں پر غصّہ اُتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک ہے، بیوی کو ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچّہ شرارت کر رہا ہے، اس کو اُلٹا لٹکا کر بیلوں والی رسّی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اُس کی بیوی اور بچّوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سُنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ اگر کوئی منع کرنے جاتے تو وہ بھی مار کھاتے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی

ہوگئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تھا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اُس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا: "ہلاس پور کی طرف جاؤ ذرا نورو کو لیتے آنا۔" بس پھر کیا تھا آگ بگولا ہوگیا: "میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔"

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا۔ اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اُتارنے کے لئے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بُلا کر اُس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لئے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لئے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لئے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلافِ معمول خاموشی سے بات سُنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا۔ چولھے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اُٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دھو کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اُتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اُس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا۔ ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے۔ اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لئے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

"اری، آنکھ پھوڑے گی۔" اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا اور گھڑونچی پر سے اُتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اُس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا

لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آجاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھا رہتا۔ اب دونوں بچّے بھی اُڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچّوں کے نام پر نوردا اور بندو رکھ دیئے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدّت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدّو خوش تھے۔ ان کی کمر دں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آرہا تھا کہ چند بچّے سڑک پر کبڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے وہ کہتا ہی رہا: "ارے میں کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں" آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ انکو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہوگئی۔

اندر آکر کواڑ بند کئے اور چراغ جلا کر اُجالا کیا۔ حسب معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کرکے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دیئے: "ارے او بندو۔ ارے او نوردے" پکارا۔ اگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دئے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائیگا۔

اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچکر اُس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جبتک مٹی ڈالکر سوراخ کو بند کر کے وہ اُترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں مگر اس نے پروانہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اُٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو ذیلدار اور کئی کسان شام کو اس جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ "ارے بندو۔ ارے نورو کہاں مر گئے۔ آج تمہیں کون کھانا دیگا۔" چند ابابیلیں کمرے میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

"بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔" کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا۔ "صبح کو شفاخانہ والوں کو پتہ دیدیں گے۔ کہ پاگل خانہ بھجوا دیں۔"

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفاخانہ والوں کو لیکر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

تین عورتیں

تین عورتیں ایک ریلوے لائن کے کنارے چلی جا رہی تھیں۔ کس مقام پر؟ کس ریلوے لائن کے کنارے؟ ان کا مذہب کیا تھا؟ ان کی ذات کیا تھی؟ یہ سب تفصیل غیر ضروری ہے۔

تین عورتیں!

ایک نوجوان سندری تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس کے سینہ میں اُبھار۔ اُس کی چال میں والہانہ پن۔

ایک ماں تھی۔ اُس کی گود میں ایک بچّہ تھا۔ لال لال بوٹی سا سات دن کا بچہ۔ بار بار ماں اپنے لال کی طرف محبّت بھری نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اور اُس کو بھینچ کر کلیجے سے لگا لیتی تھی گویا کسی آنے والے خطرے سے بچا رہی ہے۔

ایک بھکارن تھی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ کسی زمانے میں سفید رہا ہوگا۔ اب مٹی اور پسینہ سے اتنی میلی ہوگئی تھی۔ جیسے مدتوں کیچڑ میں پڑی رہی ہو۔ اس کی ساڑھی کسی زمانے میں ساڑھے پانچ گز کی ہوگی۔ اب تو پلّو پھٹتے پھٹتے وہ مشکل سے تین گز کی رہ گئی تھی۔ اور تن ڈھانکنے کے لئے بھی کافی نہ تھی۔ اس کے بال گرد سے اَٹے ہوئے تھے اور نکیلے پتھروں نے اس کے پاؤں زخمی کر دیئے تھے۔

تین عورتیں ایک ریلوے لائن کے کنارے چلی جا رہی تھیں۔

تین عورتیں!

دور جہاں ریلوے لائن کی دونوں چمکتی ہوئی پٹڑیاں ایک لمبی لکیر بن کر آسمان میں گم ہوگئی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کالا نقطہ نظر آیا۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ریلوے انجن کی سیٹی کی دھیمی آواز آئی۔

سیٹی کی آواز سنتے ہی بھکارن چوکنی ہوگئی۔ دہشت اور پریشانی کے بجائے اس کے چہرے پر ایک خوفناک ارادے کی جھلک نظر آئی۔ ایک سیکنڈ وہ ٹکٹکی لگائے سامنے آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ جہاں چھوٹا سا کالا نقطہ نظر آ رہا تھا پھر وہ جلدی سے ایک پٹڑی پھلانگ کر دونوں پٹڑیوں کے درمیان چلنے لگی۔

نوجوان سندری اور بچے کی ماں اپنی ساتھن کے چہرے پر ایک خوفناک ارادے کی جھلک دیکھ کر پریشان ہوگئیں، جیسے ہی بھکارن پھلانگ مار کر

پٹڑیوں کے درمیان آئی اس کے ساتھ ہی یہ دونوں بھی آگئیں۔

"آخر تیرا ارادہ کیا ہے؟" ماں نے بھکارن سے پوچھا۔ مگر اس کے لہجے سے معلوم ہوتا کہ یہ سوال غیر ضروری ہے۔

"تو خوب جانتی ہے۔" بھکارن نے لاپرواہی سے جواب دیا اور برابر سامنے آسمان کی طرف نظر جمائے دیکھتی رہی۔ اب وہ چھوٹا سا کالا نقطہ اتنا چھوٹا نہ رہا تھا۔

"کیا پاگل ہو گئی ہے تو؟" نوجوان سندری نے ایسے لہجے میں کہا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دفعتاً اس کو ایک بہت بڑے خطرے کا احساس ہوا ہے۔

بھکارن بڑے بڑے قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ اور دوسری دونوں عورتوں کو اتنا تیز چلنا مشکل معلوم ہو رہا تھا مگر وہ بھی کسی نہ کسی طرح اس کا ساتھ دیئے جا رہی تھیں۔

"پاگل! اور میں؟" بھکارن قہقہہ مار کر اس بُری طرح سے ہنسی کہ نوجوان سندری اور ماں دونوں ڈر گئیں۔ "پاگل میں ہوں یا تم جو اب تک زندگی سے انصاف کی آس لگائے بیٹھی ہوئی ہو؟ آخر ہمیں زندہ رہنے کی کوئی وجہ ہی کیا ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ اِس زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہوگی"

نوجوان سندری اتنی آسانی سے بازی ہارنے والی نہ تھی۔ "مگر سوچو تو میری جوانی کا تو خیال کرو۔ عورت عمر میں ایک بار ہی تو جوان ہوتی ہے۔

جب بھی زندگی کا لطف نہ اُٹھایا تو۔۔۔۔"

"جوانی!" بھکارن نے حیرت سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جوانی! وہی جوانی جس کی قیمت چار آنے ہے۔ وہی جوانی جس کو ایک خود غرض مرد نے اپنی میٹھی باتوں سے لوٹ کر تمہیں ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا! وہی جوانی جس کو تم ہر روز بازار میں بیچنے پر مجبور ہو! ہر پولیس کے سپاہی کے ہاتھ! ہر ریل کے بابو کے ہاتھ! ہر آوارہ شرابی کے ہاتھ جو چونی تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے! آخ تھو ہے ایسی جوانی پر۔"

اب ماں کی باری تھی۔ اس نے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور گویا اس کا سہارا پا کر بھکارن سے بحث کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ "مگر میرا بچہ۔ آخر اس غریب نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کو موت کے حوالے کر دوں۔ اس کی خاطر تو مجھے زندہ رہنا ہی ہوگا خواہ کتنی ہی مصیبت کیوں نہ جھیلنی پڑے۔" اور پھر بے اختیار بچے کو چھاتی سے لگا کر۔ "میرا بچہ!"

"میرا بچہ!" بھکارن کی آواز میں اس قدر طنز اور حقارت تھی کہ ماں بے زبان ہو گئی۔ "ارے یہ گوشت کا لوتھڑا جس کو تو گلے سے چمٹائے پھرتی ہے۔ یہ دنیا کی بے انصافی سماج کے ظلم کا جیتا جاگتا اشتہار۔ تیری تباہی اور بربادی کا ذمہ دار۔ آخر یہ بڑا ہو کر کیا کرے گا۔ لاٹ صاحب بنے گا یا لکھ پتی! اس ملک میں بھک منگوں کی کمی نہیں ہے! آخر کیوں نہ پھینک دیا

اس کو اس کے باپ کے دروازے پر۔ پالتا وہ بزدل کمینہ اپنے گناہ کی یادگار کو۔"

ماں جلدی سے بولی: "نہیں، نہیں۔ اُن کو کچھ مت کہو۔" اس ایک لفظ "اُن" میں عجیب پریم، عجیب لگاوٹ کی چاشنی تھی۔ اور اُس کو زبان سے نکالتے وقت ماں کی نگاہ نویلی دلہن کی طرح شرم سے جھک گئی: "ان کو کچھ مت کہو۔ وہ اپنے ماں باپ کے خیال سے مجبور تھے۔"

بھکارن غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گئی۔ چھوٹا سا کالا نقطہ اب کافی بڑا ہو گیا تھا۔ اور ہر لمحہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ ریل کی گڑگڑاہٹ سے بھی بلند اس کی آواز سنائی دی: "ماں باپ کے خیال سے یا جائداد کے خیال سے! اور تمہارے ماں باپ کی مامتا کہاں گئی تھی۔ جب انہوں نے بھادوں کی کالی رات میں تمہیں گھر سے نکال دیا اس ڈر سے کہ تمہاری حالت ظاہر ہونے پر سماج کیا کہے گی۔"

یہ کہہ کر بھکارن سامنے آنے والی ریل کی طرف بے تحاشا لپکی اور نوجوان سندری اور ماں دونوں اس کو روکنے کے لئے ساتھ ساتھ دوڑیں۔

ایک کالے دیو کی طرح ریل کا انجن پچاس میل کی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ ایک ڈراؤنی سیٹی کی آواز گونجی۔ مگر بھکارن ذرا نہ جھجکی۔

انجن کے پہیے اس کی طرف لپک رہے تھے۔

ریل کے ایک درجے میں دو بڑی توند والے بیوپاری لاکھوں کی لین دین کا سودا کر رہے تھے۔ ان کے سامنے شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اور وہ گلاس پہ گلاس چڑھا رہے تھے۔ نشہ میں دھت! اور دنیا کے دکھوں سے بے خبر۔ تیسرے درجے میں بھیڑ بکریوں کی طرح غریب اور کسان اور مزدور بھرے ہوئے تھے۔ ایک اندھا فقیر تنبورہ ہاتھ میں لئے ان کو بھجن سنا رہا تھا۔ یہ سب بھی نشہ میں، دھت! اور خود اپنے دکھوں سے بے خبر! ایک پگلا کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا بڑبڑا رہا تھا: "رام رام ست ہے۔ دھت تیرے کی! رام رام ست ہے۔ دھت تیرے کی!"

انجن کی سیٹی خوفناک طریقے سے کئی بار گونجی۔ اس کی گونج میں خطرے کا اعلان تھا۔

"رُک جاؤ۔ رُک جاؤ۔" نوجوان سندری اور ماں نے آخری بار کوشش کرتے ہوئے بھکارن سے التجا کی۔

"مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تمہیں جان پیاری ہے تو تم ہٹ جاؤ۔" ان نے اُن کو جھڑک دیا۔

"مگر تم جان دیدو گی تو ہم کب زندہ رہ سکتے ہیں؟" ان دونوں نے جواب دیا۔

انجن کی بھیانک سیٹی ایک بار پھر گونجی۔ بالکل قریب۔

نوجوان سندری بھاگتے بھاگتے بے دم ہو گئی تھی۔ مگر اس نے لپک کر بھکارن کا دامن پکڑ لیا۔ اور اس کو خطرے کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ماں نے ایک ہاتھ سے اپنے گود کے بچے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے بھکارن کو ریل کی پٹڑی سے دھکا دیکر ہٹانا چاہا۔

مگر ان کی کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ انجن اب اتنا قریب آ گیا تھا کہ بھکارن ڈرائیور کا وحشت زدہ چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ اس نے پورا زور لگا کر نوجوان سندری اور بچے کی ماں سے اپنا دامن چھڑا لیا۔

دفعتاً ریل کے ٹھیر جانے کے جھٹکے سے بیوپاریوں کا نشہ ہرن گیا۔ ان کی شراب کی بوتلیں اور گلاس جھن جھن کر کے فرش پر آ رہے۔ تیسرے درجے میں اندھے فقیر کے ہاتھ سے تنبورہ گر گیا۔ اور بھجن گانا بھول گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس جھٹکے نے غریبوں اور کسانوں اور مزدوروں کا نشہ اُتار دیا۔ مسافر اپنے اپنے درجوں سے اُتر آئے اور انجن کی طرف چلے۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟"

"کوئی ریل کے نیچے آ گیا ہے۔"

"ارے یہ تو کوئی بھکارن ہے۔"

"مگر سندر اور نوجوان۔"

"اور بیچاری کا بچہ بھی تو مر گیا۔"

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کون مر گیا۔"

"ایک عورت ریل کے نیچے آ گئی ہے۔"

پگلا جواب تک خاموش کھڑا تھا چیخ کر بولا۔ "ارے پگلو۔ ایک عورت نہیں تین عورتیں تین۔" اور پھر بڑبڑانے لگا۔ "رام رام ست ہے! دھت تیرے کی!"

دَاروغہ صاحب

"داروغہ صاحب!" ایک کانسٹبل نے ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے؟"

"حضور اس آزاد کے بچے نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ اب تک تو اس نے اپنے ساتھیوں کے نام بتائے نہیں ہیں۔ کہئے تو ایک مرتبہ اور کوشش کر دیکھیں۔

"ہاں ایک آدھ گھنٹے میں حاضر کرو۔"

کانسٹبل سلام کر کے چلا گیا۔ داروغہ صاحب نے پاؤں کی ڈبیا کھولی۔ ایک پان کھایا اور سوچ میں پڑ گئے۔ ایک ہفتہ سے اس آزاد نے اُن کا آرام حرام کر رکھا تھا۔ رات دن یہی فکر رہتی تھی کہ کس طرح اُس سے اُس

کے ساتھیوں کے نام کا اقبال کرایا جائے۔ مگر تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ پہلے معمولی طرح سے پوچھا۔ پھر معافی اور انعام کا لالچ دلایا، اس پر بھی اُس کی زبان نہ کھلی تو تھوڑی بہت مرمت کی گئی۔ آخر میں تنگ آکر اور سختی کی۔ جوتوں سے پٹوایا۔ کال کوٹھڑی میں بند کیا۔ اُلٹا لٹکوایا۔ مگر وہاں ایک نہیں کے علاوہ دوسرا جواب نہ تھا۔ داروغہ صاحب اپنے رعب اور دبدبہ کے لئے تمام صوبے میں مشہور تھے۔ ملزموں کی زبان کھلوانے کی اُن کو وہ ترکیبیں یاد تھیں کہ دور دور کے تھانیدار اُن سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ سخت سے سخت مجرم اُن کے نام سے کانپتا تھا۔ مگر یہ آزاد عجب سخت جان تھا۔ جب اُس پر تمام مجرب نسخے بیکار ثابت ہوئے تو داروغہ صاحب نے اپنے ترکش کا آخری تیر استعمال کیا جو اُس کی طرح کمزور اور تعلیم یافتہ سپاہی قیدیوں کے لئے خاص طور سے ایجاد کیا گیا تھا۔ چند دس نمبر کے بدمعاشوں کو بلوا کر اُن کو کچھ خفیہ ہدایات اور ایک ایک بوتل ٹھرّے کی دی گئی اور جب اُن پر خوب نشہ چڑھ گیا تو اُن کو بھی آزاد کے ساتھ بند کر دیا۔ رات بھر میں اُنہوں نے آزاد کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ مگر ہر گھنٹے کے بعد جب پہرے دار نے پوچھا "کیوں؟ اب بھی اپنے ساتھیوں کے نام نہ بتائے گا؟" تو یہی جواب ملا کہ "مرنے سے پہلے تو نہیں"۔

آزاد کی اس ضد کو کیسے توڑا جائے؟ رات دن یہ سوال داروغہ صاحب کے

دماغ میں گردش کرتا تھا۔ دیکھنے میں کمبخت دُبلا پتلا کمزور سا نوجوان تھا۔ مگر اُس کے خلاف الزام اتنا سنگین تھا اور اُس کے ساتھیوں کے نام اس قدر ضروری تھے کہ داروغہ صاحب کی سخت بدنامی ہوتی اگر اُس سے اقبال نہ کرایا جاتا۔ کئی مہینے سے اُس کے خلاف رپورٹیں آ رہی تھیں کہ یہ اور اُس کے ساتھی کسانوں میں بغاوت پھیلا رہے ہیں۔ باوجود یونیورسٹی کے ایک گریجویٹ ہونے کے آزاد نے ایک گاؤں میں رہنا پسند کیا تھا۔ جل پور جہاں وہ رہتا تھا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مشکل سے ایک ہزار کی آبادی ہوگی۔ فقط آزاد ہی ایک پڑھا لکھا آدمی وہاں رہتا تھا۔ اُس نے جاتے ہی گاؤں میں ایک اسکول کھول دیا۔ دن میں بچوں کو اور رات کو بڑی عمر کے کسانوں کو پڑھاتا۔ شروع شروع میں گاؤں والے اُس سے خائف رہے لیکن جلد ہی اُس نے اپنے اخلاق اور خدمت سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ کسی کو خط لکھوانے یا پڑھوانے کی ضرورت ہوتی تو آزاد کے پاس آتا۔ کسی کو چوٹ لگ جاتی تو آزاد اپنے دواؤں کے بکس سمیت مدد کو پہنچ جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس نے کتابی تعلیم کے علاوہ گاؤں والوں کو صفائی، صحت، ورزش کی بھی تعلیم دینی شروع کی۔ یہاں تک تو اُس کے کام پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ گو پولیس کے رجسٹر میں اُس کا نام مشتبہ سیاسی کارکنوں کی فہرست میں پہلے ہی شامل تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اُس کے خلاف شکایات آنے لگیں۔ گاؤں کے مہاجن رام لال کو اُس سے

شروع ہی سے بغض تھا۔ اس لئے کہ وہ کسانوں کو قرضہ لینے کے خلاف ترغیب دیتا تھا۔ اور اگر کسی کو قرضہ لینا ہوتا تو وہ اُس کے مہاجن کے گھر تک جاتا اور اپنے سامنے باقاعدہ رسید وغیرہ لکھواتا۔ اس سے پہلے اَن پڑھ کسان ہمیشہ مہاجن کی لکھی ہوئی رسید پر آنکھ بند کر کے انگوٹھے کا نشان کر دیتے تھے۔ اور اپنی قسطوں کی رسید طلب کرنے کا تو اُن کو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ لیکن آزاد نے اُن کو مہاجن کے سب ہتھکنڈوں سے واقف کر دیا تھا جس سے اُس کی آمدنی پہلے سے آدھی بھی نہ رہی تھی۔

بشیر خاں پٹواری بھی آزاد سے کوئی خوش نہ تھا جب سے اُس نے گاؤں کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا تھا کسانوں سے انتقال اراضی، لگان، آبیانہ وغیرہ کے سلسلے میں رشوت لینا مشکل ہو گیا تھا۔ آج تک اس قسم کی آمدنی کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ اور گاؤں والے بھی اُس کو خوش رکھنے ہی میں اپنی خیریت سمجھتے تھے۔ لیکن اب ..... اب تو وہ اُس سے ایک نئے اور عجیب انداز میں بات کرتے تھے۔ ایک دن تو حد ہو گئی۔ بدھوا کسان سے جب اُس کے لگان کی ادائگی کے سلسلے میں نذرانہ طلب کیا تو وہ بولا: "پٹواری جی اب وہ دن گئے۔ تمہیں سرکار سے ہماری خدمت کی تنخواہ ملتی۔ بخرانہ کہیر واسطے چاہیئے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ اس گستاخانہ گفتگو سے ایک گھنٹہ پہلے ہی آزاد نے بدھوا سے بہت دیر باتیں کی تھیں!

پنڈت شیو پرشاد بھی جو گاؤں کے مندر کا مہنت تھا آزاد کی موجودگی سے خوش نہ تھا۔ اُس کو شکایت تھی کہ یہ نوجوان اچھوتوں کو سماج سے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔ مہتروں کا ایک خاندان تھا جو ہمیشہ سے گاؤں کی صفائی کا کام کرتا آتا تھا۔ آزاد کے کہنے سے ان مہتروں نے مہنت، پٹواری۔ مہاجن وغیرہ کے گھر صاف کرنے کے معاوضے میں جھوٹا کھانا لینے سے انکار کر دیا اور اُس وقت تک کام نہ کیا جبتک اپنی ماہوار تنخواہ منظور نہ کرالی۔ اس کے علاوہ آزاد نے گاؤں والوں کو سمجھا بجھا کر ان مہتروں کے بچوں کو بھی اپنے اسکول میں داخل کر لیا تھا جہاں وہ باقی تمام لڑکے لڑکیوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اور جب ان مہتروں نے مہنت سے مطالبہ کیا کہ اگر اُس کے دعوے کے موافق وہ بھی ہندو جاتی میں ہیں تو اُن کو بھی مندر میں پوجا کی اجازت ہو، تب تو شیو پرشاد جی مہاراج کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔

مولا بخش جو گاؤں کی اکیلی مسجد کا جاہل ملّا تھا اور مہنت کی ہمیشہ مخالفت رہتی تھی۔ دونوں گاؤں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اپنا اُلّو سیدھا کیا کرتے تھے۔ مولا بخش اگر اپنی بیٹی کی شادی کیلئے مسجد کی مرمت کے نام سے روپیہ جمع کرتا تو شیو پرشاد فوراً ہندوؤں کو غیرت دلاتا کہ اُن کا مندر کیوں نہ زیادہ شاندار بنایا جائے۔ تاکہ اُن کے چندے سے پنڈتانی کے لئے ایک زیور اور بن سکے۔ مگر آزاد کے معاملے میں یہ دونوں متفق تھے کہ اُس کا

گاؤں میں رہنا اُن کے مفاد کے خلاف ہے۔ مولا بخش کہتا تھا کہ آزاد کسانوں اور اُن کے بچّوں کو انگریزی پڑھا کر کافر بنا دیگا۔ یہ بھی اُس کو کب گوارا تھا کہ مسلمان بچے۔ ہندو بچّوں کے ساتھ تعلیم پائیں اور لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق تو اُس کا مستقل فیصلہ تھا کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر وہ عاشقوں سے خط و کتابت کیا کریں گی اور جغرافیہ سیکھ کر اُن کو گھر سے نکل بھاگنے کے راستے معلوم ہو جائینگے

تحصیلدار صاحب اور اُن کا عملہ تو آزاد کی جل پور میں موجودگی کو نہایت ہی خطرناک سمجھتے تھے۔ اُن کا بس چلتا تو اُس کو ایک دن بھی تحصیل کی حدود میں نہ رہنے دیتے۔ غضب خدا کا جب دسمبر میں نائب تحصیلدار دورے پر گیا تو گاؤں والوں نے اُس کے کیمپ کے لیے مفت رسد پہنچانے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ صاحب کو جو انڈا، مرغی، گھی۔ ترکاری چاہیئے پیسے نقد دیکر لیجاؤ! تحصیلدار صاحب جب دسمبر میں خود دورے پر گئے اور جل پور میں کیمپ کیا تو اُن کی ہتک اس سے بھی زیادہ ہوئی جب اُن کی موٹر گاؤں میں پہنچی تو سوائے مکھیا، پٹواری، مہاجن، رام لال، پنڈت شیو پرشاد اور مولوی مولا بخش کے کسی ایک گاؤں والے نے اُن کا استقبال نہ کیا۔ اس سے پہلے جب اُن کی موٹر آتی تھی تو گاؤں بھر کے ننگے غلیظ اور فاقہ زدہ بچے اُن کی موٹر کو گھیر لیتے تھے۔ مرد ادب سے فاصلہ پر قطار لگا کر سلام کرتے اور عورتیں اپنے اپنے گھروں میں سے جھانک کر "تحصیلدار" اور اُن کے "موٹو کاٹ" کی زیارت کرتیں۔ تحصیلدار صاحب

شان سے اُترتے، گردن کے خفیف اشارے سے اپنی رعایا کے سلام کا جواب دیتے۔ دو چار خیرات کے پیسے بچّوں کے جھنڈ میں پھینکتے اور اُن کا رشوت کے مال سے تیار شدہ فربہ جسم اُن کے شاندار سفید خیمہ میں غائب ہو جاتا۔ لیکن اس سال تحصیلدار کو نہایت تعجب اور اُس سے زیادہ غصہ ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کی موٹر کی آواز نے گاؤں میں کوئی خاص ہل چل نہ پیدا کی۔ کسان اپنے کام میں مصروف تھے، عورتیں یا تو کھیتوں پر روٹی لیکر گئی ہوئی تھیں یا اپنے اپنے گھروں میں چرخہ کاتنے یا روٹی اوٹنے میں مصروف تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں آزاد کے اسکول میں پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ غرض تحصیلدار صاحب نے گاؤں میں بیکاری کی کمی اور خودداری کے اس مظاہرہ کو اپنی سخت ہتک محسوس کیا۔ اور جب اسی شام کو پٹواری، مہاجن، پنڈت اور مولوی جیسی گاؤں کی چار ممتاز ہستیوں نے متفقہ آزاد کی شکایت کی اور اس کے سنگین جرائم کی طویل فہرست پیش کی تو کیا وجہ تھی کہ آزاد کا کام ہلار کا وٹ جاری رہنے دیا جاتا۔

چند روز بعد اطلاع ملی کہ کسانوں کے سرغنوں کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس میں قحط اور خشک سالی کی وجہ سے لگان ادا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائیگا۔ پولیس نے کافی نگرانی رکھی اور تفتیش کی مگر اس کانفرنس کے اصل وقت کی اطلاع نہ ملی۔ کئی دن کی کوشش کے بعد ایک رات کو مخبر نے رپورٹ کی کہ اس وقت آزاد کے مکان پر کسانوں کے سب سرغنے جمع ہیں اور

کانفرنس ہو رہی ہے۔ پولیس نے چھاپہ مارا۔ مگر کسی طرح سے وقت سے کچھ ہی پہلے آزاد کے ساتھیوں کو اس دھاوے کی اطلاع مل گئی اور وہ رات کی تاریکی میں خاموشی سے نکل گئے۔ جب داروغہ صاحب اپنے جوانوں کو لیکر پہنچے تو سوائے آزاد کے مکان میں کوئی نہ تھا۔ دانت پیس کر رہ گئے۔ تلاشی کی تو البتہ کافی کارآمد کاغذات ملے۔ لگان ادا کرنے کی تحریک کے متعلق مکمل تجاویز موجود تھیں۔ جن کو پڑھ کر حکومت آسانی سے اس تحریک کو شروع ہونے سے پہلے ہی کچل سکتی تھی۔ لیکن تحریک کے سرغنوں کے ناموں کی فہرست نہ مل سکی۔ جس کے بغیر آزاد پر سازش کا جرم عائد کرنا ناممکن تھا۔ داروغہ صاحب نے اچھی طرح سے ایک ایک کونہ ٹٹول مارا۔ لیکن کوئی ایسا کاغذ نہ ملا جس سے باقی ماندہ شورش پسندوں کو پکڑا جا سکے۔ ملتا بھی کہاں سے جس اہم کاغذ کی اُن کو تلاش تھی وہ تو آزاد اُن کی آہٹ سُنتے ہی کھا چکا تھا۔

افسرانِ بالا کے ایما پر داروغہ صاحب نے آزاد کو گرفتار کر لیا اور اُس کی زبان کھلوانے کے لئے اپنی تمام مشہور ترکیبوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان مجرب نسخوں کے بیکار ثابت ہونے نے پریشان کر رکھا تھا۔

اب کون سی ترکیب کروں؟ یہی سوچتے سوچتے داروغہ صاحب اونگھ گئے۔ آج گھر میں بیوی نے کافی مرغن کھانا پکایا تھا۔ اس پر گرمی کا موسم دوپہر کا وقت۔ ایک سپاہی پنکھا کھینچ رہا تھا۔ خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ نیند

آہی گئی۔

کچھ آہٹ ہوئی تو داروغہ صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے خاصا اندھیرا تھا۔ کچھ نیند کا نشہ بھی سوار تھا۔ دھندلا دھندلا سا نظر آتا تھا۔ مگر داروغہ صاحب پہچان گئے کہ جس کا انتظار وہ کر رہے تھے آزاد کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور سپاہی رسّی پکڑے ساتھ تھا۔ اُس کے ذہین چہرے پر پچھلے سات دن کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا اثر نمودار تھا۔ مگر وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ آزاد کی مستقل مزاجی اور ضد سے زیادہ جو چیز داروغہ صاحب کو پریشان کرتی اور غصہ دلاتی تھی وہ اُس کی مستقل مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ جس میں اعتماد نفس کے ساتھ داروغہ صاحب کی حرکتوں پر اظہارِ حقارت بھی تھا، تلوار سے زیادہ گھاؤ لگانے والی آگ سے زیادہ جھلسانے والی تھی۔ آزاد کو مسکراتے دیکھ کر داروغہ صاحب کے مزاج کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا سپاہی سے چیخ کر کہا۔

"دیکھتا کیا ہے۔ مار اس کو جبتک یہ اپنے ساتھیوں کے نام نہ بتائے"

سپاہی نے سوت کی رسّی کو جو اُس کے ہاتھ میں تھی دہرا کر کے کوڑا سا بنایا اور ایک قدم پیچھے ہٹا تاکہ آزاد کی پیٹھ پر پورے زور سے مار پڑ سکے۔

آزاد برابر مسکرا رہا تھا اور اسکی نظر داروغہ صاحب پر گڑی ہوئی تھی بجائے خوف کے داروغہ صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ اُن کو حقارت اور رحم کر

دیکھ رہا ہے۔

سپاہی نے رسّی کے کوڑے کو آزمائشی طور سے ہلایا، اپنے ہاتھ اور آزاد کی کمر کے درمیان فاصلے کا اندازہ کیا اور پوری طاقت سے وار کیا۔

داروغہ صاحب کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی معلوم ہوتا تھا کہ کوڑا گویا اُن کی ہی کمر پر پڑا۔

آزاد کے چہرے پر مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔

سپاہی سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہا۔ دھڑا دھڑ۔ دھڑا دھڑ۔ وہ آزاد کی کمر پر برابر کوڑے چلا رہا تھا۔

داروغہ صاحب تکلیف سے چیخ رہے تھے۔ گو بظاہر سپاہی آزاد کی کمر پر وار کر رہا تھا۔ مگر ہر وار کی چوٹ اُن کی کمر پر پڑتی تھی۔

اور آزاد برابر مسکرا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ داروغہ صاحب کی تکلیف پر ہنس رہا ہے۔

سپاہی نے یہ دیکھ کر کہ آزاد پر اُس کی مار کا کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا ہے اور زیادہ طاقت سے چلانا شروع کیا۔

داروغہ صاحب تکلیف سے چیخنے رہے۔ اُن کی کمر کوڑوں کی مسلسل بوچھاڑ سے پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔

سپاہی نے ایک اور بھرپور ہاتھ آزاد کی کمر پر چلایا تو داروغہ صاحب سے

بالکل برداشت نہ ہو سکا۔ معلوم ہوتا تھا اگر ایک بھی اور کوڑا اُن کی کمر پر پڑا تو اُن کی جان جائے گی۔

"بس۔ بس" داروغہ صاحب بے تحاشا چیخے۔ "بند کرو۔ بند کرو۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے کرسی سے اُٹھنا چاہا تو آنکھ کھُل گئی۔

کمرہ خالی تھا۔ تو کیا میں نے خواب دیکھا ہے؟ اُنہوں نے سوچا۔ لیکن اُن کا تمام جسم پسینہ سے شرابور تھا۔ اور کمر۔۔۔۔۔ اور کمر میں چوٹ کی تکلیف سی سخت درد ہو رہا تھا۔

پریشان ہو کر داروغہ صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اُن کی چھوٹی لڑکی کھڑی اُن کی کمر تھپک رہی تھی۔ باپ کی گھبراہٹ دیکھ کر بچی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

برآمدہ میں قدموں کی آہٹ ہوئی اور سپاہی آزاد سمیت داخل ہوا وہ کمبخت اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"کیا حکم ہے حضور؟" سپاہی نے پوچھا۔

داروغہ صاحب نے ایک ہاتھ سے اپنی کمر کو ٹٹولا دوسرے سے پسینہ صاف کیا۔ تاکہ پریشانی ظاہر نہ ہو۔ مگر آواز قابو میں نہ تھی۔

"ک۔۔۔۔۔ ک۔۔۔۔۔ کیا ہے؟ ک۔۔۔۔۔ ک۔۔۔۔۔ کون ہے؟"

صوبے کا سب سے بارعب داروغہ ایک مجرم کے سامنے ہکلا رہا تھا۔ ہاں۔۔۔

یہ آزاد صاحب...... ان...... ان...... ان کو رہا کر دو۔ سازش کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔"

آزاد داروغہ صاحب کی پریشانی دیکھ کر مسکرایا گویا وہ اس کی اصل وجہ سے واقف تھا۔

سپاہی نے خیال کیا کہ داروغہ صاحب کے دفاغ پر گرمی کا اثر ہو گیا ہے مگر حکم کی تعمیل میں ہتھکڑی کھول دی۔ اور آزاد کے ہمراہ باہر چلا گیا۔

داروغہ صاحب نے اپنی بچی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُن کی کمر پھر تھپک رہی تھی۔ گویا ان کو ایک اچھے کام کی شاباش دے رہی ہو۔

اُس دن سے داروغہ صاحب کے رعب کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اُن کا شمار صوبے کے سب سے زیادہ ناکارہ پولیس افسروں میں ہوتا ہے۔

معمار

بُندو معمار خوش تھا۔ آج اُس کا اکلوتا بیٹا ابراہیم اپنی بیوی یعنی بُندو کی بہو، کو مکلاوہ کر کے گھر لے آئیگا۔ آج سے اُس کے اندھیرے گھر میں بہو کے آنے سے چاندنا ہو جائیگا۔ شاید اُس کے قدموں کی برکت سے بُندو کی قسمت بھی جاگ اُٹھے۔ اور کیا پتہ بُندو کو روزگار پھر نصیب ہو جائے۔

بندو معمار آج خوش تھا۔ پورے پانچ سال بعد اُس کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک نظر آئی تھی۔ آج تو اُسے حقے کے دھوئیں میں بھی نیا لطف حاصل ہو رہا تھا۔ اپنے مین کے جھونپڑے کے سامنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھا وہ بھولی بھالی بھٹیاری کے محل پیچھے سورج کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ لال لال۔ گلابی گلابی۔ نیلے نیلے بادل آسمان پر چھائے

ہوئے تھے۔ جیسے اُس کی بہو کا چپ دار ڈوپٹہ جو آج ہی وہ رنگریز کے ہاں سے رنگوا کر لایا تھا۔ ڈوپٹہ گھٹیا موٹے ململ کا تھا۔ سوسی کا پاجامہ۔ جاپانی نقلی ریشم کا کرتا۔ چاندی کے دو کڑے ہاتھوں کے لئے۔ بس یہی تو کل سامان تھا جو وہ اپنی بہو کے مکلاوے کے جوڑے کے لئے مہیا کر سکا۔ آج اگر وہ بے روزگار نہ ہوتا تو کیا ایسا گھٹیا جوڑا اور چاندی کا صرف ایک زیور دیتا اپنی بہو کو۔ کچھ نہیں تو اطلس کا پاجامہ، بنارسی کام کا ڈوپٹہ، سونے کی مرکیاں، سونے کے کڑے اور چاندی کے جھانجن تو ضرور ہی بنواتا۔ آخر ایک ہی بیٹا تو تھا اُس کا۔ آج اُس کی ماں اگر زندہ ہوتی تو کیا.....

سورج کے ساتھ بُندو کے چہرے کی مسکراہٹ بھی بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ اُس کی بیوی کو مرے ہوئے دس برس ہو چکے تھے۔ پھر بھی اُس کی یاد آتے ہی بُندو کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ کتنا چاؤ تھا اُس کو اپنے بیٹے کے بیاہ کا۔ کاش آج وہ زندہ ہوتی۔

تھوڑی دیر تک بُندو خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر جب دوسرے جھونپڑوں میں چراغ جلنے لگے تو اُس کو خیال آیا کہ اُس کا گھر اندھیرا پڑا ہے۔ اب اُس کا بیٹا بہو کو لیکر آنے والا ہی ہوگا۔ ایسے موقع پر گھر میں روشنی کا نہ ہونا شاید بدشگونی کا باعث ہو۔ یہ سوچ کر وہ اُٹھا اور اندر جا کر کڑوے تیل کا چراغ جلایا۔ آج اُس نے اپنے گھر کو خاص طور سے صاف کیا تھا۔

گھر کیا تھا چار دیواروں کے اندر بارہ فٹ مربع کچی زمین گھری ہوئی تھی اوپر ٹین کی چھت جو گرمی کے دنوں میں تپنے لگتی تھی، برسات میں ٹپکتی تھی اور جاڑوں میں ٹھنڈی برف ہو جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک کوٹھری کے جھونپڑوں میں بُندو کے سب ہمسائے رہتے تھے۔ اُن کی یہ آبادی نئی دہلی سے میل بھر پرے پہاڑی پر تھی۔ پانچ برس پہلے تک وہ سب آٹھویں دہلی کی تعمیر کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ مگر جب شہر بن کر تیار ہو گیا تو وہ سب بیکار ہو گئے فاقوں پر نوبت آ گئی۔ بُندو خاندانی معمار تھا۔ اپنے فن کا ماہر۔ اُس کے باپ دادا نے لال قلعہ اور جامع مسجد جیسی عمارتیں بنائی تھیں۔ بُندو نے وائسرگل لاج اور اسمبلی چیمبر۔ پھر بھی وہ اب چھوٹے چھوٹے مکانوں کی تعمیر میں چونے گارے اُٹھانے کی مزدوری کرنے پر مجبور تھا۔ اب جب سے جنگ شروع ہوئی تھی تو لوہے، لکڑی اور سیمنٹ کی قیمتیں بڑھ جانے کی وجہ سے بیٹے نے ایک ٹھیکیدار کے مکان پر بیراگیری کی ملازمت کر لی تھی۔ اُسی کی تنخواہ سے گزارہ ہوتا تھا۔ کتنا دکھ ہوا تھا بُندو کو جب اُس کے بیٹے نے یہ نوکری کرنا منظور کی تھی۔ بُندو معمار کا بیٹا اور نوکری! مانا کہ اُس کو دس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور کھانا مفت اور اس سے زیادہ تو آجکل معماروں کو بھی کہاں نصیب تھا۔ مگر ایک معمار پھر معمار ہی ہوتا ہے۔ کاریگر اپنے فن کا ماہر۔ اپنے وقت۔ اپنے ہاتھ پاؤں۔ اپنے دل اور دماغ کا مالک۔ یہاں جی چاہے

کام کرے۔ جس وقت جی چاہے کام کرے۔ وہ کسی کا ملازم نہیں کہ کوئی اُس پر رعب جمائے۔ بُندو کو خاندانی معمار ہونے پر فخر تھا۔ کتنا اہم کام تھا اُس کا۔ اُس کی ذرا سی غفلت سے دیوار ٹیڑھی رہ جائے تو پوری عمارت بدنما معلوم ہونے لگے۔ وہ اور اُس جیسے معمار ہی تو انجنیئروں کے نیلے نقشوں کو خوبصورت اور شاندار عمارتوں میں تبدیل کرتے تھے۔ اینٹ اور گارے اور چونے سے تاج محل جیسا حسن، قطب مینار جیسی عظمت، جنتر منتر جیسی حکمت پیدا کرتے تھے۔ نقاش اپنی تصویروں میں رنگ بھر کر شاہکار بناتا ہے۔ بُت تراش پتھر کی مورتوں میں جان ڈالتا ہے۔ موسیقار اپنے ستار کے تار چھیڑ کر محفل کے جذبات کو متہ و بالا کر دیتا ہے۔ اسی طرح معمار محرابوں اور ستونوں، دیواروں اور دروازوں، دریچوں اور جھروکوں، جالیوں اور کٹہروں، میناروں اور گنبدوں کلسوں اور کنگوروں کے ذریعے تخلیقِ حسن کرتا ہے۔ اور آج ایک ایسے معمار کا بیٹا دن بھر ایک جاہل، بدتمیز ٹھیکے دار کی خدمت کرنے پر مجبور رہے۔

بُندو اقتصادی مسائل سے ناواقف تھا۔ سیاست سے اُسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اُس کو تو یہ شکایت بھی نہ تھی کہ یہ نئی دہلی سات سمندر پار والے فرنگیوں کے لئے کیوں بسائی گئی ہے۔ اُس کو دُکھ تھا تو یہ کہ معماروں کا اب کوئی قدرداں نہ رہا تھا۔ اُس جیسا ماہر معمار بے روزگار ہو۔ آخر کیوں؟

وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ دروازے کے باہر کسی کے کھانسنے کی

آواز آئی۔

"ارے بھئی بُندو۔ کہو بہو آ گئی؟"

"آؤ چچا خیرالدین۔ اندر آؤ۔ بہو کو لینے گیا ہے ابراہیم۔ اب آتا ہی ہوگا۔"

چچا خیرالدین جن کے متعلق روایت مشہور تھی کہ شاہجہان کی سب عمارتوں کا سنگِ بنیاد اُنہوں نے ہی رکھا تھا، لاٹھی ٹیکتے اندر داخل ہوئے۔ وہ معماروں میں سب سے بڑے تھے اور اپنی برادری کے سرپنچ، گرو، نیتا، سب کچھ سمجھے جاتے تھے۔

"چلو اچھا ہوا۔ ابراہیم کی بہو آ جائے گی تو تیرے کھانے حقے کی تو خبر رکھے گی۔ مگر بُندو۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر چچا خیرالدین رک گئے گویا کچھ کہتے ہوئے جھجکتے ہوں۔

"کہو۔ چچا۔"

"بھئی کہنا کیا تھا۔ ایسے ہی خیال آیا کہ پوچھ لوں کہ رات کو تو کہاں سوئیگا۔"

"میں کہاں سوؤنگا؟ کیوں؟" اور پھر دفعتاً بُندو چچا خیرالدین کا اشارہ سمجھ گیا۔ آج اُس کا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ پہلی رات بسر کریگا۔ اور اُن کے گھر میں صرف یہ ایک کوٹھری بارہ فٹ مربع۔ اتنی جگہ بھی تو نہیں تھی کہ بیچ میں پردہ ہی ٹانگ لیں۔ کم از کم آج کی رات دولہا دلہن کو تخلیہ چاہیئے۔

"فکر مت کر۔ تو میرے ہاں پڑ رہیو۔" یہ کہہ کر چچا خیرالدین کچھ کھسیانی سی کھانسی

کھانستے ہوئے چل دیئے۔ گویا ہمدردی کے اظہار سے شرماتے ہوں۔

"نہیں میں چچا خیرالدین کے ہاں نہیں جاؤں گا۔" بُندو نے دل ہی دل میں کہا: "برادری والے سب میرا مذاق اُڑائیں گے۔ میں کہیں اور پڑ رہوں گا۔" یہ سوچ کر اُس نے الگنی پر سے اپنی گاڑھے کی چادر اُتار کر کندھے پر ڈال لی۔ سردی چمک رہی تھی۔ "کہیں سر چھپانے کی جگہ ملی تو یہی اوڑھ کر لیٹ رہونگا۔ ایک رات ہی کی تو بات ہے۔"

اتنے میں اُس کا بیٹا اپنی بیوی کو لیکر آگیا۔ وہ اُس کا دیا ہوا جوڑا پہنے ہوئے، گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی۔ بُندو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس نئی دلہن سے کیا بات کرے۔

"کیوں بھئی ابراہیم آگئے تم لوگ؟" اُس نے خاموشی توڑنے کے لئے بیکار سا سوال کیا اور بغیر جواب کا انتظار کئے: "اچھا تو تم آرام کرو۔ آج کی رات میں کہیں اور سو جاؤنگا۔" کہا اور جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

نئی دہلی کا شہر میلوں تک جگمگا رہا تھا۔ پہاڑی پر سے بُندو کو ایسا معلوم ہوا جیسے سنگِ اسود کے فرش پر کسی معمار نے ہیروں کو جڑ دیا ہو۔ "اتنے بڑے شہر میں۔" اُس نے سوچا۔ "کیا ایک آدمی کو رات بسر کرنے کی جگہ نہیں مل سکتی؟ کوئی کمرہ کوٹھری نہیں تو کسی برآمدے ہی میں پڑ رہونگا۔"

نئی دہلی کے راستے بُندو کو خوب یاد تھے۔ آخر کیا یہ اُس کے اپنے ہاتھوں

سے بنایا ہوا شہر نہیں تھا؟ وہ ہر عمارت سے واقف تھا۔ یہ ہے وائسریگل لاج
لاٹ صاحب کے رہنے کا مکان۔ اس میں کئی سو کمرے ہیں۔ ہر کمرہ اتنا بڑا کہ اس
میں بُندو جیسی دس کوٹھریاں آ جائیں۔ غسل خانے۔ سنگِ مرمر کے۔ درجنوں
وہ بھی تو کسی کمرے سے چھوٹے نہیں۔ اور کیا فرش ہیں چکنی اور چمکیلی ہوتی۔
چاہے کھانا بکھیر کر کھالو۔ ناچنے کا بڑا کمرہ۔ چاروں طرف آئینے ہی آئینے اور
لکڑی کی فرش پر ایسا پالش کہ وہ بھی آئینہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ اسی پر تو صاحب
لوگ اور اُن کی میمیں ناچتی ہیں۔

مگر آج وائسریگل لاج میں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔ ہاں ٹھیک یاد آیا۔
بڑے دنوں کی چھٹیوں میں لاٹ صاحب کلکتہ جاتے ہیں نا؟ تو یہ اتنا بڑا
محل خالی پڑا ہے۔ سینکڑوں کمرے۔ کمرے سے بڑے غسل خانے۔ میلوں
لمبے برآمدے۔ آئینے جیسی فرش والا ناچنے کا کمرہ۔ سب خالی۔ کیا اس کے
کسی گوشے میں کسی گودام کی کوٹھری۔ کسی برآمدے میں بھی بُندو معمار کو سر
چھپانے کی جگہ نہیں مل سکتی؟ وائسریگل لاج کے صدر دروازے کے
پاس بُندو کو ایک لکڑی کی کابک نما کوٹھری نظر آئی۔ شاید یہی خالی پڑی ہو۔
اور وہ رات یہاں ہی بسر کر سکے۔ مگر وہ ادھر بڑھا ہی تھا کہ اس کابک میں
سے ایک بڑی مونچھوں والا سپاہی نکلا اور بُندو کو دیکھ کر للکارا "کون ہے؟"
اور پھر قریب آ کر "ابے او اچکے۔ یہاں کیا سونگھتا پھر رہا ہے۔ کیا لاٹ صاحب

کی کوٹھی میں نقب لگانے کا ارادہ ہے؟" بُندو وہاں سے چپکے سرک آیا۔ اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہے۔

نئی دہلی کی سڑکیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ چوڑی صاف شفّاف سڑکیں۔ بندو کے مکان کا فرش بھی ایسا نہیں تھا۔ بجلی کی روشنی سے رات پر دن کا گمان ہوتا ہے۔ مگر بجلی کی روشنی میں گرمی بھی تو نہیں ہوتی جو بُندو کسی ہنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ ہی تاپ لیتا۔ ڈاکخانے کے گھنٹے نے دس بجائے۔ اب وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ بندو تیز تیز چلنے لگا۔ تاکہ بدن میں کچھ گرمی آجائے۔ مگر ہوا اتنی ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا اُس کی ہڈیوں میں کوئی برف کے بھالے چبھو رہا ہے۔

اُس کے دماغ میں وائسریگل لاج کا نقشہ گھوم رہا تھا۔ ایک آدمی کے رہنے کا مکان، ہاں۔ لاٹھ بھی تو ایک آدمی ہی ہوتا ہے۔ پھر اُس کے لئے کئی سو کمروں کی ضرورت ہے۔ اور ایک ایک کمرہ اتنا بڑا کہ جسمیں معماروں کی ساری بستی سما جائے۔ درجنوں غسل خانے، میلوں لمبے برآمدے۔ ناشتہ کا کمرہ الگ۔ دوپہر کے کھانے کا الگ۔ رات کو کھانا کھانے کا کمرہ الگ۔ اور وہ شیشہ جیسی فرش والا ناچ کا کمرہ ایک آدمی کے لئے یہ سب کچھ اور بُندو معمار کے لئے جس نے اپنے ہاتھوں سے ان سب عمارتوں کو بنایا تھا رات گزارنے کو ایک کوٹھری بھی نہیں۔ عمر میں پہلی مرتبہ بُندو کے دماغ میں ایک باغیانہ سوال گھوم رہا تھا۔ "کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟"

اسی طرح چلتے چلتے بُندو نے دہلی کی ساری سڑکیں طے کر ڈالیں۔ مگر کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا نہ ملا جب سڑکوں کی روشنیاں پیچھے رہ گئیں تو بُندو دفعتاً رُک گیا۔ یہ سامنے کونسی عالیشان عمارت ہے جو چاندنی رات میں چمک رہی ہے۔ اب اس کو یاد آیا کہ یہ تو ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ شاید اس دروازے کے کسی کونے میں پڑ رہنے کی جگہ مل جائے۔ بُندو کی تھکی ہوئی ٹانگوں میں پھر جان آگئی اور وہ اور جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا مقبرہ کی طرف چلا۔ مگر دروازہ میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ محکمہ آثار قدیمہ کے ایک چپراسی نے ڈانٹ پلائی۔

"ابے کون ہے تو؟ نکل سالے یہاں سے نہیں تو ایک رسید کرتا ہوں"۔

اب بُندو میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ اس سے بحث کرتا یا اُس کی خوشامد ہی کرتا۔ وہ اُلٹے پیروں واپس ہو گیا۔ پھر نئی دہلی کی طرف چل دیا۔ اب اُس کے دماغ میں دوہرا ہیجان بپا تھا۔ بادشاہ مر بھی جائے تو اُس کی مردہ ہڈیوں کے لئے اتنا بڑا محل چاہیئے اور میری زندہ ہڈیوں کے لئے ایک کوٹھری بھی نہیں۔ آخر یہ ہمایوں کا مقبرہ کس نے بنایا تھا۔ میرے باپ دادا نے۔ اور آج مجھے یہاں سے کُتّے کی طرح دھتکار کر نکال دیا......

کیوں؟ آخر کیوں؟.... لاٹھ صاحب کا محل...... تین چار سو کمرے...... چائے پینے کا کمرہ الگ...... سگرٹ پینے کا کمرہ الگ...... شراب پینے کا کمرہ الگ...... اور ایک بادشاہ...... جس کو مرے ہوئے کئی سو

برس ہو گئے..... اس کی قبر کے لئے بھی محل چاہیئے.... اور بُندو معمار کے لئے کچھ بھی نہیں۔ آخر کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟

جب ٹانگوں نے چلنے سے جواب دیدیا تو سڑک کے کنارے ہی بُندو چادر لپیٹ کر لیٹ گیا۔ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ برف کے بھالے چبھتے رہے مگر پھر بھی بُندو سو گیا۔

صبح کو پہاڑی کے پیچھے سے سُورج نے منہ نکالا اور نئی دہلی پر سے کہرے کا نقاب ہٹایا۔ سورج کی کرنیں وائسریگل لاج پر پڑیں مگر اُسکی سنگین دیواروں کو توڑ کر آگے نہ جا سکیں۔ ایک کالے دیو کی طرح وائسریگل لاج کا سایہ زمین پہ رینگتا ہوا آیا اور بُندو معمار کی ٹھٹھری ہوئی لاش کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

رادھا

رادھا آج کتنی خوش تھی۔ دیوالی کے دن ہمیشہ اس کے ناچ کے متوالوں کا غیر معمولی مجمع ہوتا تھا۔ کم از کم سو روپے آمدنی کی اُمید تھی۔ اس موقع کیلئے اُس نے ایک بالکل نیا پُجارن کا ناچ سوچ رکھا تھا اور یقین تھا کہ وہ سب کو پسند آئیگا۔

رادھا نے اپنا لہنگا اوپر سرکایا اور گورے گورے سڈول ٹخنوں پر گھنگرو باندھنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ گانا بھی گنگنا رہی تھی جو آج کے مجرے میں وہ گانے والی تھی۔ دوسرے کمرے میں سازندوں نے اپنے اپنے سازوں کو چھیڑنا شروع کر دیا تھا رادھا کا جسم موسیقی کی اطاعت کرنے کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ ناچ کی گت سُنتے ہی بے اختیار اس کا رواں رواں رقص کرنا شروع کر دیتا۔ بچپن سے اُسکو ناچنے کا شوق تھا ناچ ہی اُس کا مذہب تھا۔ ناچ ہی اُس کی زندگی۔ ناچتے وقت وہ اپنے تمام دکھوں تمام تکلیفوں، تمام ذلتوں کو بھول جاتی تھی۔ جیسے ہی سازندوں نے مشق کے لئے ایک چُلبلے ناچ کی گت بجانی شروع کی۔ رادھا کے دونوں پاؤں زمین پر تال کے ساتھ

حرکت کرنے لگے۔ چھُن چھُن۔ چھُن۔ چھُنا چھُن۔ چھُن چھُن۔ چھُن۔ چھُنا چھُن۔

"رادھا۔ رادھا بٹیا!" ہانپتے کانپتے، پسینے میں شرابور استاد جی کمرے میں داخل ہوئے معلوم ہوتا تھا بڑے میاں زینہ پر تین تین سیڑھیوں کو ایک جست میں پھلانگتے ہوئے آ رہے تھے۔

"کیا ہے استاد جی؟" رادھا نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اس بوڑھے گویّے کو بہت پسند کرتی تھی جس نے اُسے بچپن میں ناچنا اور گانا سکھایا تھا اور جو اُس وقت سے رادھا کے باپ، دوست، مُشفق اور دلّال کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

"رادھا" استاد جی سانس کو قابو میں لاتے ہوئے بولے۔ "آج ہماری قسمت جاگ اُٹھی ہے۔ آج لکشمی دیوی واقعی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی ہیں۔"

"کیا ہُوا استاد جی؟ آخر کچھ بتاؤ گے بھی؟"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آج جل پور کے راجہ صاحب ہمارے ہاں مجرے میں آ رہے ہیں۔ راجہ صاحب جل پور! کچھ سمجھیں!"

"جی ہاں۔" رادھا نے موقع کی اہمیت سے مرعوب ہو کر جواب دیا۔ "مگر ان راجہ صاحب کے متعلق تو کچھ بتایئے، کیا بُوڑھے ہیں راجہ صاحب۔"

"بوڑھے؟" استاد جی نے اتنے حقارت آمیز لہجہ میں یہ لفظ ادا کیا گویا بڑھاپا تو دنیا میں صرف ان کا حق تھا۔ "بوڑھے؟ بھئی کمال کر دیا۔ ارے ان راجہ صاحب

کی تو پیدائش مجھے ایسی یاد ہے جیسے آج کا دن۔ ان کے والدِ مرحوم راجہ صاحب نے جو جلسہ بیٹا ہونے کی خوشی میں کیا تھا وہ بھی یاد ہے۔ اہا ہا۔ کیا شاندار جلسہ تھا۔ کچھ نہیں تو پورے چھ طائفے ہوں گے۔ راجہ صاحب کی عمر پچیس چھبیس سے زیادہ تو ہرگز نہ ہوگی۔ ابھی پانچ ہی برس تو ہوئے اُن کی شادی کو۔ تمہیں یاد نہیں۔ تمہاری بیچاری ماں بھی تو گئی تھی اس موقع پر ناچنے۔ مگر، ہاں، تم تو جب بہت ہی کم عمر تھیں اس لئے تمہیں......

اُستاد جی کا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا۔ کیونکہ اُنہوں نے دفعتاً اپنی غلطی محسوس کرلی تھی۔ اُن کو رادھا کی ماں کا ذکر نہ کرنا چاہیئے تھا۔ ماں کی موت کا صدمہ رادھا کو بہت ہوا تھا۔ چھ مہینے تک تو وہ ادھ موئی ہوگئی تھی۔ کسی بات کا ہوش نہ رہا تھا۔ ناچنا بھی بھول گئی تھی۔ چند مہینے سے استاد جی اس کا جی بہلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے تھے۔ مگر اب بھی کوئی بھولے سے گفتگو میں اسکی ماں کا ذکر کردیتا تو رادھا دفعتاً غم کے بے پایاں سمندر میں ڈوب جاتی تھی۔

"بٹیا۔ بٹیا......" استاد جی اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش میں ہکلانے لگے۔ "رو مت۔ مجھے یہ ذکر ہی نہیں چھیڑنا چاہیئے تھا۔ اچھا اب آنسو پونچھ ڈالو۔ دیکھو آج دیوالی کی رات ہے۔ اب جلدی تیار ہوجاؤ راجہ صاحب آنے والے ہی ہوں گے۔"

ایک سازندہ گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ "راجہ صاحب آرہے ہیں۔"

رادھا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور اپنی ہچکیوں کو گھونٹ دیا۔ یہ رونے دھونے کا وقت نہیں ہے۔ اور پھر ناچنے والی طوائف کو کب یہ حق ہے کہ وہ اپنے غم کا اظہار کرے۔ یہ سوچ کر وہ اپنی لاچاری پر خود ہی مسکرائی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں دُکھ ہی دُکھ تھا۔

راجہ صاحب جل پور ایک قدر آور نوجوان تھا۔ راجپوتی شان اس کے چہرے اور ٹیڑھے صافے سے ٹپکتی تھی۔ اس کے انداز گفتگو اور عام برتاؤ میں ایک قسم کی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ دولت اور طاقت انسان کو معمولی تکلفات اور جھجک سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ مسند پر بیٹھے وہ ناچتی ہوئی رادھا کو بیباک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی تجربہ کار اور جہاندیدہ آنکھیں رادھا کے جسم کی بوٹی بوٹی کو ٹٹول رہی تھیں، پرکھ رہی تھیں، دولت کی ترازو میں تول رہی تھیں۔ اُس کے سیاہ چمکیلے بال جن کو ناگن جیسی لہراتی چوٹی میں گوندھا گیا تھا اُس کا دلکش کتابی چہرہ اور گلابی ہونٹ جو پیار کرنے کے لئے ہی بنائے گئے تھے، اُس کا سینہ جس میں نوجوانی کا خمیر اُٹھ رہا تھا، اُس کی پتلی کمر جو چولی اور لہنگے کے درمیان چمک رہی تھی، اُسکے سڈول گورے گورے ٹخنے جو ناچ کے دوران میں اکثر برہنہ ہو جاتے تھے۔ راجہ کی آنکھوں نے ان سب چیزوں کی قیمت لگائی اور دماغ ہی میں میزان کر کے فیصلہ کر لیا کہ دس ہزار پر بھی یہ سودا

بُرا نہیں ہے۔ اور ممکن ہے خریدنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ کرائے پر مل جائے عورت کے جسم کی قیمت بھی تو قسط وار ادا کی جا سکتی ہے۔ راجہ نے اپنی عمر میں ہر قوم اور رنگ کی عورتوں کے جسم خریدے تھے۔ خود اس کی بیوی کافی حسین تھی۔ مگر راجہ تنوع کا قائل تھا۔ ہر سال اپنی موٹر بدلتا تھا اور موٹر کے ساتھ ساتھ.....

رادھا نے ناچ ختم کیا تو اُس کی داد دینے کے لئے کمرے میں راجہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ اور سب تماشائی راجہ کے سکرٹری کا اشارہ پاکر آہستہ آہستہ اٹھ چکے تھے۔ اور لوگوں کو غائب دیکھ کر رادھا کو کسی قدر مایوسی ہوئی کیونکہ وہ ہمیشہ ایک مجمع کے سامنے ناچنا چاہتی تھی، اُن کی تعریف اور "واہ۔ واہ" کی خواہش مند تھی۔ اتنے آدمیوں کو اپنے ناچ سے خوش کر کے اُس کو بھی خوشی ہوتی تھی۔ یہی اُس کا انعام تھا اور یہی اُس کی زندگی کا روشن ترین پہلو۔ اسی سے اُس کا حوصلہ بڑھتا تھا اور بہتر سے بہتر ناچ ناچنے کی اُمنگ دل میں پیدا ہوتی تھی۔ اُس کے کوٹھے پر تو بیس پچیس ہی کا مجمع ہوتا تھا۔ اگر باہر کہیں کسی شادی بیاہ کے جلسے میں جاتی تو دو تین سو آدمی اُس کا ناچ دیکھنے جمع ہو جاتے تھے۔ مگر رادھا تو چاہتی تھی کہ ہزاروں کا مجمع ہو اور اس میں وہ ناچے اور ایسا ناچے کہ ہر ایک اُس کے کمال فن کا معترف ہو جائے۔ اور ہال یا منڈپ ان کی تالیوں سے گونج اُٹھے۔

"واہ۔ واہ۔ سُندر۔ سُندر۔" ہزاروں تالیوں کے شور کے بجائے صرف راجہ کی تالیوں کی آواز خالی کمرے میں عجیب معلوم ہوئی۔ مگر عادت کے بموجب رادھا نے مسکرا کر اور ہاتھ جوڑ کر راجہ کا شکریہ ادا کیا۔ پان کی تھالی پیش کی۔ راجہ نے پان کا بیڑہ اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور جیب سے سَو روپے کا نوٹ نکال کر تھالی میں رکھ دیا۔ رادھا نے پھر سلام کیا اور ادب سے آنکھیں جُھکا کر (جیسا کہ اُستاد جی نے سکھایا تھا) بیٹھ گئی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" راجہ نے سوال کیا۔

"رادھا۔"

"جیسی سُندر ہو ویسا ہی نام بھی سُندر ہے۔" راجہ نے بغیر کسی شرم یا جھجک کے کہہ دیا۔ اور دل میں سوچا۔ "آواز بھی اچھی ہے۔" راجہ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے تین سال کے قیام کے دوران میں ولایت کی بھی حسین ترین عورتوں کو دیکھا تھا۔ مگر رادھا میں اُسے کچھ اور ہی دلکشی نظر آتی تھی۔ کم از کم اس وقت اس کی نظر میں رادھا کے سامنے تمام دنیا کی عورتیں ہیچ تھیں۔

"کہو، رادھا، میں پسند ہوں؟" — راجہ جانتا تھا کہ اس طبقہ کی عورتوں سے ایسی بے تکلفی کی گفتگو جائز ہے۔

سازندے اپنے اپنے ساز سنبھال کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تجربہ کار ایکٹروں کی طرح جن کو معلوم ہے کہ کس وقت سٹیج چھوڑ دینا چاہیئے۔

"ہاں، راجہ صاحب، مگر میں بھلا کس قابل ہوں۔" رادھا نے انکسار سے جواب دیا۔ امیر آدمیوں سے اسی طرح بات کرنی چاہیئے۔ یہی استاد جی نے سکھایا تھا اگر کوئی ادنےٰ درجے کا آدمی ایسے سوال کی جرأت کرتا تو ممکن ہے تھپڑ کھاتا

"تو پھر کیا تم میرے محل میں رہنا پسند کرو گی؟" راجہ نے مطلب کی بات کہی۔ رادھا کو اس سوال کا جواب دینے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے پیشے کے سنگین قاعدے اور قانون کے بموجب وہ شرمائی، اُستاد جی کی طرف مدد اور مشورہ کیلئے دیکھا۔ ایک ادا سے پلّو سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں، راجہ صاحب۔" اُستاد جی نے جلدی سے کہنا شروع کیا ایک ایسے دوکاندار کی طرح جس کو ڈر ہو کہ کہیں گاہک ناراض ہو کر نہ چلا جائے۔ "یہ تو رادھا کی عین خوش قسمتی ہے۔ اُس کے بھاگ جاگ اُٹھے ہیں۔"

راجہ نے اپنے سکرٹری سے دبی آواز میں کچھ باتیں کیں اور پھر "اچھا، میں جاتا ہوں" کہتا ہوا زینہ سے نیچے اُتر گیا۔ اب سکرٹری اور اُستاد جی میں کاروبار کی باتیں شروع ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد رادھا کو معلوم ہوا کہ پانچ سو روپے ماہوار پر اس کو راجہ کے ہاتھ "فروخت" کر دیا گیا ہے۔ رادھا کو اس خبر سے نہ کوئی خاص خوشی ہوئی نہ افسوس۔ کم از کم راجہ اتنا بدصورت تو نہ تھا۔ جیسے وہ موٹا اور بدبودار زمیندار جس کو رادھا کا پہلا گاہک ہونا نصیب ہوا تھا!

اگلے دن رادھا اپنے سب ساز و سامان کے ساتھ راجہ کے محل میں اُٹھ گئی۔ اُس رات کو رادھا کا کوٹھا ویران اور اندھیرا پڑا رہا۔ اور بازار والوں نے رادھا کے گھونگروؤں کی سُریلی آواز نہ سُنی۔

تین مہینے بعد.....

ایک پُرتکلف اور آراستہ کمرے میں رادھا اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی یہ کمرہ راجہ نے خاص طور سے رادھا کے لئے سجایا تھا۔ مگر اس وقت اس کی تمام آرائش پر ہلکے ہلکے اندھیرے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ باہر سورج غروب ہو رہا تھا مغرب کی پہاڑیاں سیاہ دیو معلوم ہوتی تھیں۔ درختوں کے سائے آہستہ آہستہ بڑھ کر تمام زمین پر چھا رہے تھے۔ جوں جوں اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ رادھا کے چہرے پر بھی سوچ اور فکر کا گہرا رنگ چڑھتا جا رہا تھا۔

تین مہینے میں پہلی بار رادھا کو سوچنے اور اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اپنی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ اپنی جیسی سب عورتوں کی طرح وہ حقیقت شناس تھی اور اپنی قسمت پر قانع۔ اُس کو معلوم تھا کہ رنڈی کی اولاد کی سماج میں کیا جگہ ہے اور گو وہ ذلت محسوس کرتی تھی۔ مگر سماج سے لڑنے کی اُس میں نہ ہمت تھی نہ خواہش۔ رنڈی کی بیٹی شہر کی بہترین ناچنے والی ہی کیوں نہ ہو۔ رنڈی ہی رہے گی۔ اس پیدائشی بندھن سے کوئی چھٹکارا نہ تھا۔ اور

پھر اوروں کے مقابلے میں رادھا بہت آرام سے تھی۔ ایک جوان صحت مند راجہ کی داشتہ ہونا اس سے تو ہزار درجہ بہتر تھا کہ وہ بازار میں بیٹھ کر ہر رات کو ایک نئے گاہک کے ہاتھ اپنا جسم فروخت کرے۔ یہاں سوائے راجہ کے کسی کی مجال نہ تھی کہ رادھا کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ رہی پریم اور بیاہ اور گرہستی کی خواہش —— جو ہر عورت کے دل میں ہوتی ہے، خواہ وہ رنڈی ہی کیوں نہ ہو —— سو اس خواہش کو ہمیشہ اپنے دل کے سب سے گہرے کونے میں دبا کر رکھنا چاہیئے کیونکہ اُس کی قسمت میں یہ نعمتیں نہیں ہی نہیں۔ اُستاد جی نے اُسے بتایا تھا کہ انسان بھگوان سے نہیں لڑ سکتا اور جس حالت میں بھگوان نے انہیں پیدا کیا ہے اُس کو بدلنے کی کوشش کرنا سب سے بڑا پاپ ہے۔

مگر آج نہ معلوم کیوں رادھا کے دل میں ایک بے چینی سی تھی۔ بیکار اور خوفناک خواہشیں اُس پر نرغہ کئے ہوئے تھیں۔ کاش میں بھی ایک بیاہتا بیوی ہوتی! کاش میں بھی ایک ماں ہوتی! کاش سماج میں میرے لئے بھی ایک عزت کی جگہ ہوتی! اس وقت وہ اپنی موجودہ حالت کے عیش و آرام سب کو قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ عورت کے محسوسات اور جذبات جو سماج، اور مذہب اور قانون سے بھی پرانے اور مضبوط ہیں آج پھر بغاوت پر آمادہ تھے۔

رادھا کی بے چینی کی وجہ جل پور کی رانی تھی۔ اسی نے رادھا کی حقیقت

شناسی کو متزلزل کر دیا تھا۔

جب سے وہ راجہ کے محل میں آئی تھی رادھا نے رانی کی لاجواب خوبصورتی کی تعریفیں سُنی تھیں۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ آخر اتنی خوبصورت بیوی گھر میں ہوتے ہوئے راجہ صاحب مجھ جیسی بازاری عورتوں کے پیچھے کیوں پھرتے ہیں" (اس کو معلوم نہ تھا کہ دولت والوں کے چاؤ بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہ گھر کا اچھا کھانا چھوڑ کر تبدیلیٔ لذت کے لئے اکثر ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں) کئی بار رادھا نے راجہ سے کہا کہ وہ زنانے میں جا کر ایک بار رانی کو دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر ہر بار کسی نہ کسی بہانے سے راجہ نے اُس کو ٹال دیا۔ پیاری میں تم سے پریم کرتا ہوں اور تم مجھ سے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے پریم میں کسی تیسرے کا ذکر بھی مخل ہو۔" مگر ان باتوں سے رادھا کو تسلی نہ ہوئی بلکہ رانی کو دیکھنے کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ آخر کار ایک دن اس نے بوڑھی لچھمی سے اپنی خواہش کا ذکر کیا۔ لچھمی راجہ کے گھرانے کی پُرانی ملازمہ تھی اور اُس کو خاص طور سے رادھا کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ جب رادھا نے بہت اصرار کیا تو وہ تیار ہو گئی اور ایک دن جب راجہ شکار پر گیا ہُوا تھا وہ رادھا کو پھٹے پُرانے کپڑے پہنا کر زنانے محل میں لے گئی۔ ایک آراستہ دالان میں بیش قیمت پر رانی براجمان تھی۔ حسین، پُر رعب اور مغرور۔ رادھا ایک کونے میں ادب سے لچھمی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کسی نے اس کو پہچانا نہیں تھا۔ جس نے دیکھا بھی

وہ یہی سمجھی کہ لچھمی اپنی کسی بھانجی بھتیجی کو رانی صاحبہ کے درشن کرانے لائی ہے رادھا یہ سُن کر مسکرادی کہ اس محفل میں ذکر خود اسی کا ہو رہا تھا۔

"رانی جی" ایک منہ چڑھی داسی کہہ رہی تھی "آپ اس کلموہی رادھا کو کیوں نہیں نکلوا دیتیں۔ اس چڑیل نے راجہ صاحب کو بالکل اپنا کر رکھا ہے۔"

رانی نے بات کا جواب دیئے بغیر کہا "میں نے سُنا ہے کہ وہ ہے کافی خوبصورت۔"

"آپ کی تو جوتی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی"۔ ایک خوشامدی عورت جلدی سے بولی۔

"مگر کیا آپ کو اس سے حسد نہیں محسوس ہوتا؟" قریب کے ایک زمیندار کی بیوی نے سوال کرنے کی جرأت کی۔

رانی کا جواب تیز چھُری کی طرح رادھا کے کلیجے کے پار ہو گیا "میرا اس کا کیا مقابلہ! میرے لئے اس بازاری عورت سے حسد کرنا بھی توہین ہے اس کے علاوہ کونسا راجہ یا زمیندار ایسا ہے جو ایک آدھ داشتہ عورت نہیں رکھتا بازار کی ناچنے والی کبھی گھر کی مالکن کا مقابلہ کر سکتی ہے!"

رادھا یہ طمانچہ برداشت نہ کر سکی۔ چپکے سے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔ "بازار کی ناچنے والی کبھی گھر کی مالکن کا مقابلہ کر سکتی ہے!" رانی کے الفاظ اب تک اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ وہ اس کو پریشان

کر رہے تھے، پاگل بنا رہے تھے۔ ان الفاظ میں گویا رانی نے رادھا کو ایک آئینہ تھما دیا تھا جس میں اس کو حقیقت کی بھیانک شکل نظر آ گئی تھی۔ اس آئینہ میں اپنی اصلی حیثیت دیکھ کر رادھا کانپ اُٹھی۔

اگر رادھا سماجی اور اقتصادی مسائل پر فلسفیانہ غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتی تو وہ ان تمام حالات پر غور کرتی جو اس کے موجودہ پست رتبہ کے ذمہ دار تھے۔ مگر اس وقت تو وہ صرف ایک عورت تھی —— ایک عورت جس کے سوئے ہوئے نسوانی جذبات دفعتاً بیدار ہو گئے ہوں۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتی تھی کہ "بازار کی ناچنے والی کبھی گھر کی مالکن کا مقابلہ نہیں کر سکتی" اس کا دل دفعتاً آرزوؤں اور اُمنگوں سے بھرپور ہو گیا۔ "کاش میں بھی کسی کی بیاہتا بیوی ہوتی! کاش میری بھی اولاد ہوتی! کاش میں بھی ماں کہلاتی کاش میں بھی کسی گھر کی مالکن ہوتی —— چاہے وہ گھر جھونپڑا ہی کیوں نہ ہو"۔ یہ سب ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ مگر پھر بھی چاروں طرف کے اندھیرے میں روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ کیا راجہ نے ہزاروں مرتبہ اپنے پریم کا اعلان نہیں کیا تھا؟ کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا۔ "رادھا تمہارے لئے آسمان کے تارے بھی توڑ کر لا سکتا ہوں"؟ . . . . . .

. . . . . کیا اس نے یہ نہیں کہا تھا: "میں دھرم اور سماج کے بندھنوں کو نہیں مانتا۔ میرا دھرم تو بس پریم ہے۔" اگر اس کو رادھا سے واقعی اتنی محبت تھی تو وہ کیسے اس سے شادی کرنے سے انکار کر سکتا تھا؟ اور اگر وہ واقعی راضی ہو جائے ـــــ اس خیال سے رادھا کا چہرہ چمک اُٹھا۔ گھریلو زندگی کا سکون۔ سماج میں ایک باعزت پوزیشن۔ اولاد۔ مگر ایک خیال تھا جو رادھا کی اس خوشنما تصویر کو بگاڑ رہا تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد سماج اس کو ناچنے کی اجازت نہ دے گی۔ اور ناچ رادھا کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ اس کے بغیر اس کا جیون پھیکا اور نامکمل رہ جائے گا۔ ناچ کا شوق اس کے خون، گوشت اور ہڈیوں اور ہر ایک رگ میں رچا ہوا تھا وہ نہ صرف ناچنا چاہتی تھی بلکہ ایک محفل کے سامنے ناچنا چاہتی تھی۔ وہ "واہ واہ" کے نعرے اور تالیوں کی گونج سننے کی خواہشمند تھی۔ وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی کہ ایک دن وہ کسی بڑے تھیٹر کی سٹیج پر اپنا ناچ دکھا کر ہزاروں سے خراج و تحسین وصول کرے گی۔ جب سے وہ راجہ کی داشتہ بن کر آئی تھی اس کو صرف ایک آدمی کے سامنے ناچنا پڑتا تھا۔ یہی ایک بات اس کیلئے ایک سوہانِ روح تھی۔ مگر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناچ کا خیال چھوڑ دینا ـــــ یہ رادھا جیسی کلاکار کے لئے کیسے ممکن تھا؟ مگر سماج میں عزت پانا اور گھریلو زندگی کی عافیت کو حاصل کرنا بھی تو کوئی آسان کام نہ تھا۔ رادھا جیسی سینکڑوں

رنڈیاں اسی امید موہوم میں زندگی کے دن گزار دیتی تھیں۔ پتنی اور ماں بننے کے لئے اُس کو اپنے ناچ کو قربان کرنا ہی پڑے گا۔ رادھا نے دل کڑا کر کے فیصلہ کر لیا۔

برآمدے میں جانے بوجھے قدموں کی آواز سُنائی دی اور دن بھر کے تھکا سے تھکا ہُوا راجہ داخل ہُوا۔ "کہو جانِ من کیا حال ہے؟" اس نے اپنی بندوق پھینک کر رادھا کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتاؤ تم نے آج مجھے کتنی بار یاد کیا؟" رادھا نے استاد جی نے کے سکھائے ہوئے نخرے کے ساتھ سر ہلا دیا۔

راجہ نے سگریٹ جلا کر دھوئیں کے بادل اڑانے شروع کر دیئے۔ جلد ہی اس نے محسوس کیا کہ رادھا کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ "رادھا کیا بات ہے؟ تم پریشان معلوم ہوتی ہو۔" اور پھر پریم بھرے لہجے میں۔ "بتاؤ میری جان۔ تمہیں بھی میری قسم ہے۔"

رادھا نے پوری ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "راجہ صاحب..... میں آپ سے پریم کرتی ہوں ــــ بہت پریم کرتی ہوں۔" اور پھر نگاہیں جھکا کر "راجہ صاحب۔ کیا ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی؟"

یہ سن کر راجہ کو کوئی خاص تعجب نہیں ہُوا۔ اس کو معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ سوال ضرور ہی ہو گا۔ اس نے سوچا۔ "یہ عورتیں سب ایک ہی سانچے

کی ڈھلی ہوتی ہیں۔" اب تک جتنی لڑکیاں اس نے داشتہ رکھی تھیں ان سب نے چند مہینے کے بعد شادی کی فرمائشیں کر کے راجہ کے مزے کو کرکرا کرا دیا تھا۔ رادھا بھی آخر کار اسی دھرّے پر آ گئی۔ حالانکہ راجہ کو اُمید ہو چلی تھی۔ کہ کم از کم وہ سمجھدار ثابت ہو گی۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں، راجہ صاحب؟" رادھا نے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ سے اتنا بھی پریم نہیں کرتے۔ کہ شادی کر لیں؟"

"یہ لڑکی اب وبالِ جان ہوئی جا رہی ہے۔" راجہ نے سوچا۔ مگر وہ خوبصورت تھی اور ابھی تک اس سے عیش پرست راجہ کا دل نہیں بھرا تھا۔ ابھی چند دنوں تک اس کو کسی نہ کسی طرح راضی رکھنا چاہیئے۔

"پیاری۔ میری جان رادھا۔" اور یہ کہہ کر تجربہ کار عیاش نے رادھا کو بھینچ کر گلے لگا لیا اور اس کے گالوں اور ہونٹوں پہ بوسوں کی بارش کر دی۔ "تو کیا تم بھی اس شادی بیاہ کے ڈھکوسلوں کو مانتی ہو۔ میں تو بس ایک ہی چیز میں اعتقاد رکھتا ہوں ——— وہ ہے پریم! پریم جو دو دلوں کو ملاتا ہے۔ پریم جو عورت اور مرد کے تعلقات کی اصل بنیاد ہے۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں اور تم مجھ سے پریم کرتی ہو۔ اگر کسی پنڈت نے ہم دونوں کے پلّو باندھ کر اور ہون کے چاروں طرف پھرا کر چند اشلوک پڑھ دیئے تو کیا

فرق پڑ جائے گا؟ میں تو کہتا ہوں پریم کو سماج کے بندھنوں میں جکڑنا ایک پاپ ہے۔ مہا پاپ۔"

رادھا راجہ کی گود میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے مضبوط بازوؤں میں جکڑی ہوئی۔ راجہ کے فلسفہ پہ وہ فوراً ایمان نہ لا سکی۔ "مگر راجہ صاحب ہمیں رہنا تو اسی سنسار میں ہے۔ اور یہ سماج بغیر بیاہ کے پریم کو پاپ سمجھتی ہے۔ میں آپ کی ہونا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

"رادھا جانی! میری تو تم ہمیشہ رہو گی میرے جیون میں آج تک کوئی ایسی لڑکی نہیں آئی۔ جس سے میں نے اتنا پریم کیا ہو۔ جتنا تم سے کرتا ہوں۔ اور نہ اب کبھی آئے گی۔ میں تمہارے گالوں کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ہمیشہ تم سے پریم کروں گا۔" اور رادھا کے گال چوم کر۔" لو یہ ہو گیا ہمارا بیاہ۔۔۔۔ دو دل ملے بیاہ ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ رہی سماج تو میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔ ہزاروں کو کھلا کر کھاتا ہوں۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ اور دیکھو، پیاری، میں تو ولایت بھی ہو آیا ہوں۔ وہاں تو کوئی بھی شادی بیاہ کا قائل نہیں ہے۔ بس سب پریم کے پجاری ہیں۔"